قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر
اشاعت کا سترواں سال

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

جون 2020ء

علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ

"لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ" (الحدیث) حضرت محمد ﷺ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ باطل ہے





ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے
خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے
عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں
تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے

(اقبالؒ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پرویز صاحب کے علمی اسلوب تحقیق کی تائید

قرآنی نظریات کی روشنی میں مغرب کے غلط تصورات کی تردید میں محترم پرویز اور ہمارے ہاں کے مفکرین نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ان میں سے ڈاکٹر علامہ اقبال، ڈاکٹر رفیع الدین احمد اور ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کی تصنیفات سے چند اقتباسات پیش کئے جا رہے ہیں۔ جب بھی قارئین ان اقتباسات کی روشنی میں محترم پرویز صاحب کی تصنیفات کا جائزہ لیں گے تو وہ ان تمام خوبیوں کو بشمول دیگر خوبیوں کے ان میں پائیں گے۔ اس موضوع پر محترم پرویز صاحب کا موقف جاننے کے لئے خصوصی طور پر ان کی تصانیف ''انسان نے کیا سوچا'' اور ''اسلام کیا ہے'' ملاحظہ فرمائی جاسکتی ہیں۔

(1) ڈاکٹر علامہ اقبالؒ کا موقف:

1- عقل اور وحی میں تصادم نہیں بلکہ دونوں لازم وملزوم ہیں۔

2- قرآن سے راہنمائی حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ:

(الف) اپنے زمانوں کے تقاضوں اور اپنے دور کی فکری کاوشوں سے متعارف ہوں۔

(ب) قرآن کریم کو عربی زبان اور تصریفِ آیات کی رو سے سمجھنا چاہئے اور اس پر خارجی عناصر کو اثرانداز نہیں ہونے دینا چاہئے۔

(2) ڈاکٹر محمد رفیع الدین کا موقف:

مغرب کے غلط فلسفیانہ تصورات کی تردید قرآنی نظریات سے کرتے ہوئے مصنف کے لئے ضروری ہے کہ:

1- وہ روحِ قرآن کے ساتھ پوری پوری واقفیت پیدا کریں جس کے بغیر قرآنی اور غیر قرآنی تصورات میں تمیز کرنا مشکل ہوگا۔

2- وہ مغرب کے غلط تصورات کے اصل ماخذ اور ان کے متبعین کے طرز خیال وعمل سے پوری پوری واقفیت پیدا کریں۔

3- وہ علم کے تمام شعبوں سے یعنی مادی، حیاتیاتی اور نفسیاتی علوم اور فلسفہ سے جو ان علوم کو جمع کر کے ایک مکمل نظریہ کائنات ترتیب دیتا ہے، اس حد تک واقف ہوں کہ ان کی ساری وسعت میں جہاں کہیں کوئی اسلامی تصور موجود ہو اسے پہچان کر لے سکیں اور استخراج اور استنباط سے مزید صحیح اسلامی تصورات کو اخذ کر سکیں۔

بقیہ صفحہ نمبر 66 پر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

جون 2020ء

جلد 73 | شمارہ نمبر 06

ناشر و چیئرمین: محمد اکرم راٹھور

مجلسِ ادارت

ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر منظور الحق خواجہ ازہر عباس

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلّی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِتعاون: 50 روپے فی پرچہ
پاکستان: 600 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک: 1000 روپے سالانہ
بیرونِ ملک: 2500 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک: 5000 روپے سالانہ

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ (43:11)	ادارہ	4
قیامِ پاکستان کے بعد پہلی عید کی کہانی پرویز صاحب کی زبانی	ادارہ	6
قومیں کیوں تباہ ہوتی ہیں؟ (قسط نمبر:1)	غلام احمد پرویزؒ	8
قرآنی نظام	ادارہ	25
نفسِ انسانی صرف اسلامی نظام میں نشوونما پاتا ہے	خواجہ ازہر عباس (کراچی)	34
اللہ تعالیٰ کا میرا العقول نظامِ ربوبیت	ڈاکٹر سید عبدالودود	43
نوجوانوں کا صفحہ: نخلِ سینا (نشست نمبر:7)	محمد علی صابر صدیقی	48
بچوں کا صفحہ: دوسروں کے لئے جیو	ادارہ	53

ENGLISH SECTION

Surah Muhammad (محمّد) - Durus-al-Qur'an: Chapter 7 By G. A. Parwez (Translated by: Mansoor Alam) Episode No.2	55
Surah Al-Najm (النجم) – Durus-al-Qur'an: Chapter 2 By G. A. Parwez (Translated by: Mansoor Alam) Episode No.1	59

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان)
Phone: 042-35714546
Cell: 0321-4460787
idarati@gmail.com www.facebook.com/Talueislam

Bank Account Idara Tolu-e-Islam
National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulberg Lahore
For Domestic Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672
For International Transactions
IBAN:PK36NBPA0465004073177672
Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

بیا ساقی نوائے مرغِ زار از شاخسار آمد
بہار آمد نگار آمد قرار آمد
کشید ابر بہاری خیمہ اندر وادی و صحرا
صدائے آبشاراں از فرازِ کوہسار آمد
سرت گردم تو ہم قانونِ پیشیں ساز دہ ساقی
کہ خیل نغمہ پردازاں قطار اندر قطار آمد
کنار از زاہداں برگیر وبیباکانہ ساغر کش
پس از مدت ازیں شاخِ کہن بانگ ہزار آمد
بہ مشتاقاں حدیث خواجۂؐ بدر وحنین آور
تصرف ہائے پنہانش بچشمم آشکار آمد
دگر شاخِ خلیلؑ از خونِ ما نم ناک می گردد
ببازارِ محبت نقد ما کامل عیار آمد
سر خاکِ شہیدے برگہائے لالہ می پاشم
کہ خونش با نہالِ ملت ما سازگار آمد
''بیا تا گل بیفشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم وطرحِ دیگر اندازیم''

(بانگِ درا۔ علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ادارہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لمعات

لَا عَاصِمَ الۡیَوۡمَ مِنۡ اَمۡرِ اللّٰہِ (11:43)

’’آج اس ابتلاء سے کہیں پناہ نہیں مل سکتی‘‘ کا جیتا جاگتا منظر آنکھوں کے سامنے آ جائے‘ قوموں کی زندگی میں ایسے حوادث کم آتے ہیں‘ لیکن قوم اور قوم میں فرق ہوتا ہے۔ اس طرح کے طبعی حوادث زندہ اقوام پر بھی آتے ہیں۔ اول تو انہوں نے اپنی پیش بینی سے پہلے ہی احتیاطی وحفاظتی تدبیریں اختیار کر رکھی ہوتی ہیں اور اگر معاملہ ان کی حد سے بڑھ جائے تو پوری قوم اٹھ کھڑی ہوتی ہے اور متاثرین کو اس طرح سنبھال لیتی ہے کہ ان کو اپنے نقصان کا احساس تک نہیں ہوتا (موجودہ وقت میں چین کی مثال ہمارے سامنے ہے۔) حادثہ کے گزر جانے کے بعد عمائدین قوم سر جوڑ کر بیٹھ جاتے ہیں اور غور وفکر کرتے ہیں کہ ہماری تدابیر میں کیا کمی رہ گئی تھی اور اس کو آئندہ کیسے پورا کیا جا سکتا ہے۔ ایک ہم ہیں کہ نہ متبوعین کو اس کا خیال ہے کہ ایسے حادثات وسانحات کا کوئی مستقل حل سوچنا چاہئے اور نہ متبعین کو اس کا احساس کہ زندگی کو کسی ڈھب پر گذارنے کی شکل پیدا کرنی چاہئے۔ آج سے پچاس سال قبل ’’طلوع اسلام‘‘ نے انہی صفحات پر‘ سیلاب کے تباہی مچانے کے بعد‘ ان الفاظ میں اربابِ حل وعقد کے سامنے دردمندانہ گذارش کی تھی:

> ’’اگر ہمارے ہاں خدمتِ خلق کے لئے ادارے موجود ہوں تو خدمت کا سلسلہ فی الفور شروع کیا جا سکتا ہے یہ ایسی کمی ہے جو ہمیں آفات وحوادث کے وقت بے چارا سا بنا دیتی ہے اور ہمارے نقصانِ جان ومال میں اضافہ کا باعث بنتی ہے۔ اگر اب بھی اس نکتہ کو سمجھ لیا جائے اور ایسی (تربیت یافتہ کارکنان پر مشتمل) تنظیمیں قائم کر لی جائیں تو ملک کو بہت سے غیر ضروری مصائب سے بچایا جا سکتا ہے۔‘‘

لیکن افسوس ہے کہ ہم آج بھی اسی مقام پر ہیں جہاں پر نصف صدی قبل کھڑے تھے۔

باقی رہے ہمارے مذہبی راہنما' سو جب کبھی اس طرح کے حوادث آتے ہیں تو وہ یہ کہہ کر اپنے آپ کو اطمینان اور قوم کو تسکین دے لیتے ہیں کہ سب ہمارے گناہوں کا نتیجہ ہے۔ کہنے کو تو وہ ''ہمارے گناہ'' کہتے ہیں لیکن اس سے ان کی مراد ہوتی ہے ارباب حکومت و قیادت کے گناہ۔ کیونکہ ان کے نزدیک یہی وہ طبقہ ہے جو فسق و فجور میں مبتلا رہتا ہے اور اسی کی وجہ سے خدا کا عذاب آتا ہے۔ یہ خیال کہ طبعی حوادث' آندھیاں' سیلاب (وبائیں) اور زلزلے خدا کا عذاب ہیں جو ہمارے گناہوں کی وجہ سے ہم پر نازل ہوتا ہے اس قدر عام ہے کہ اس سے متعلق اکثر ہم سے لوگ پوچھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ قوم کو اس طرف آنے ہی نہیں دیا جاتا کہ فطرت کے حوادث کا علاج قوانین فطرت کے مطابق ہوتا ہے جس کے لئے تدابیر اختیار کرنی چاہئیں۔ برعکس اس کے قوم کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ یہ ابتلا خدا کی طرف سے ہے اس لئے کوئی ان کی روک تھام نہیں کرسکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان طبعی حوادث کو انسانوں کی نیکی اور بدی سے کوئی تعلق نہیں ہے اس میں کفر و ایمان کو بھی کوئی دخل نہیں ہوتا۔ قطرینا وریٹا طوفانوں کی مثالیں آپ کے سامنے ہیں۔ قرآن کریم نے تسخیر فطرت کو آدمی کے لئے عام بتایا ہے۔ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا (45:13) یعنی کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے اسے ہم نے تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے۔ اس کا مخاطب آدمی ہے کوئی خاص گروہ نہیں ہے۔ اس لئے دنیا کی جو قوم بھی چاہے تسخیر فطرت کرسکتی ہے' جو قوم ایسا کرے گی وہ طبعی حوادث کی تباہ کاریوں سے محفوظ ہو جائے گی اور جو ایسا نہیں کرے گی نقصان اٹھائے گی۔

قرآن نے زندگی کی ایک سطح حیوانی بتائی ہے۔ حیوان فطرت کو تسخیر نہیں کرسکتا۔ ایک درجہ آدمیت کا ہے۔ آدمی تسخیر کر سکتا ہے۔ تیسرا مقام مومن کا ہے جو متاع فطرت کو نوع انسانی کی پرورش کے لئے عام کرتا ہے۔ کوئی مقامِ مومن تک نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ مقامِ آدم تک نہ پہنچ جائے۔ بقول اقبالؔ:

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

مقامِ مومن مشکل ہے تو ہمیں ان حادثات طبعیہ سے بچنے کے لئے کم از کم مقام آدمیت تک آنا پڑے گا یعنی تسخیر فطرت کی صلاحیت حاصل کرنی ہوگی اور اس کے لئے قومی کردار پیدا کرنا پڑے گا۔ ہمارے لئے یہ خوف ناک عالمی وباء فطرت کا ایسا اشارہ ثابت ہوسکتا ہے جس کو سمجھنے سے ہم اپنی تقدیر سنوار سکتے ہیں۔ ان اشاروں کو سمجھنے کے لئے جس شعور اور جرأت کی ضرورت ہوتی ہے جب اس سے اقوام آگاہ ہوتی ہیں تو ان کی اجتماعی زندگی کے مظاہر محیر العقول ہو جاتے ہیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد پہلی عید کی کہانی پرویز صاحب کی زبانی

(ماخوذ از درسِ قرآن از پرویز، مورخہ 15 اگست 1980ء، اس ضمن میں تصویر اگلے صفحہ پر دیکھئے۔)

عید آزاداں شکوہِ ملک و دیں عید محکوماں ہجومِ مومنین

''عید تو میں نے کہا آزاد لوگوں کی ہوتی ہے، محکوموں کی عید کیا صاحب! ایک ہجوم ہے اکٹھا ہو گیا۔ وہاں جو آئے تو ذہن میں آیا کہ اب جو عیدِ آزاداں ہے، اس کی پہلی عید ہمیں میسر ہو گی، وہ ساری خوشیاں ہمارے ذہن میں تھیں اور ہمیں پہلی عید جو آئی اپنی آزاد مملکت میں تو وہ اس کیفیت سے عید آئی تھی۔ عجب کیفیت ہے، میں اس کیف اور سرور کو نہیں بھول سکتا جو وہاں عید کی دو رکعتوں میں مجھے سعادت نصیب ہوئی۔ قائداعظمؒ (محمد علی جناح) اگلی صف میں تھے، ان کے بعینہٖ ٹھیک پچھلی صف میں، بالکل ان کے پیچھے، میں کھڑا تھا۔ ایک عظیم شخصیت جس نے ہندو جیسی قوم کی غلامی کی زنجیروں سے چھڑا کر ہمیں آزادی دی تھی۔ وہ مردِ مومن جنہیں میں دس سال سے قریب سے جانتا تھا، دل بھی مومن، دماغ بھی مومن بڑی بلند شخصیت اور ان کے پیچھے یہ سعادت کہ دو رکعتیں نماز کی ادا کی گئیں۔ اقبالؒ (1877-1938ء) نے ''جاوید نامہ'' میں کہا ہے، عجیب چیز ہے۔ وہاں تو دو رکعتیں وہ جلال الدین افغانی اور سید حلیم پاشا کے ذکر میں آیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ

با چنیں مرداں دو رکعت طاعت است

اس قسم کے انسانوں کے ساتھ اگر کہیں دو رکعت نماز کی مل جائے، اطاعت اس کو کہتے ہیں۔

ورنہ آں کارے کہ مزدش جنت است

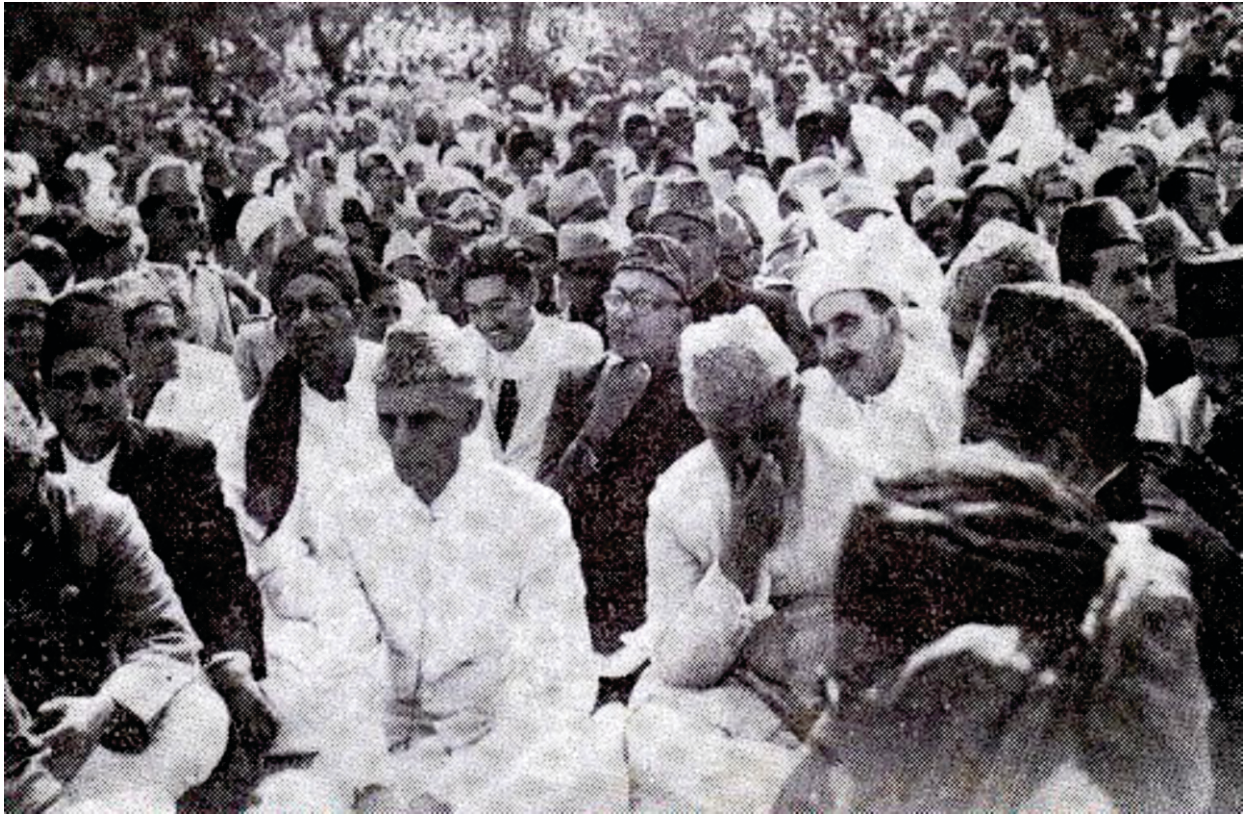
''ورنہ او دیہاڑی ہوندی ہیگی اے، جیہدی جنت ملدی ہوندی ہیگی آ'' کیا بات ہے اقبالؒ کی!

با چنیں مرداں دو رکعت طاعت است ورنہ آں کارے کہ مزدش جنت است

میں نے کہا ہے کہ اس کے لئے دیہاڑی کا ہی لفظ صحیح آتا ہے، ورنہ یہ وہ کام ہے جس کی مزدوری میں جنت مل جاتی ہے۔ اطاعت تو اس قسم کے مردوں کے ساتھ دو رکعتیں ادا کرنا ہے۔ عزیزانِ من! وہ دو رکعتیں جو میں نے ادا کی ہیں، اس مردِ مومن کے پیچھے کھڑے ہو کر، میں ساری عمر ان کا کیف و سرور نہیں بھول سکتا۔ لیکن اس عید کے بعد جب وہ کھڑے ہوئے اور ہجوم کر کے لوگ ملنے کے لئے جا رہے تھے، ان کی آنکھوں کا جو نم تھا وہ مجھ سے ہزار داستانیں کہہ رہا تھا۔ عید کی خوشی میں مل رہے تھے لوگوں سے، جگر میں ٹیس لب ہنسنے پہ مجبور، عزیزانِ من! وہ پہلی عید جس طرح سے غم آلود گزری، 33 سال ہو گئے 33 عیدیں آئیں، ایک عید بھی تو خوشی کی نصیب نہیں ہوئی ہے۔ پتہ نہیں کہ یہ طرح ایسی پڑ گئی اس پہلی عید کی ہمارے ہاں، میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ کیا ہوا۔ ''عیدِ آزاداں شکوہِ ملک و دیں'' ایک شاعر کا مصرع ہے، وہ اس لئے کہ اس نے سچ کہا تھا اس نے عیدِ آزاداں کہا تھا۔ آزادی محض مملکت کے نقشے کے اوپر لکیر کھینچنے سے تو حاصل نہیں ہو جاتی۔ آزادی اور چیز ہوتی ہے۔ ملک کا آزاد ہو جانا اور چیز ہوتا ہے، انسانوں کا آزاد ہونا اور چیز ہوتا ہے۔ وہ نہیں نصیب ہو سکی۔ اس کے باوجود آپ جانتے ہیں کہ میں تو ان میں سے ہوں جو کہا کرتا ہوں کہ ؎

مِلّت کے ساتھ رابطۂ اُستوار رکھ پیوستہ رہ شجر سے، اُمیدِ بہار رکھ! (اقبال: بانگِ درا)

قائداعظم اور پرویز صاحب کی ایک نادر تصویر
(قیامِ پاکستان کے بعد پہلی عید کی نماز پڑھتے ہوئے)



غلام احمد پرویزؒ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

میں تجھ کو بتاتا ہوں، تقدیرِ اُمم کیا ہے

قومیں کیوں تباہ ہوتی ہیں؟

(خدائی فیصلے)

قرآن کریم انسانی تاریخ کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔ اتنی اہمیت کہ اس نے کہا ہے کہ: وَلَقَدۡ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکُمۡ اٰیٰتٍ مُّبَیِّنٰتٍ وَّمَثَلًا مِّنَ الَّذِیۡنَ خَلَوۡا مِنۡ قَبۡلِکُمۡ (24:34) ہم نے تمہاری طرف واضح قوانینِ زندگی نازل کئے اور اس کے ساتھ اقوامِ سابقہ کی سرگزشتیں بھی۔ اقوامِ سابقہ کی سرگزشتیں بیان کرنے سے مقصد کیا تھا، یہ نکتہ قابلِ غور ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جس طرح خارجی کائنات میں کوئی واقعہ یونہی اتفاقیہ نمودار نہیں ہوتا، وہ نتیجہ ہوتا ہے ان قوانینِ فطرت کی کارفرمائی کا جن کے مطابق یہ عظیم کارگہِ کائنات سرگرمِ عمل ہے۔ اسی طرح انسانوں کی دنیا میں بھی کوئی تبدیلی یونہی بلا اسباب رونما نہیں ہوجاتی۔ اس کے لئے بھی خدا کی طرف سے اٹل قوانین مقرر ہیں۔ جو قوم ان قوانین کے مطابق اپنا نظام قائم کرتی ہے وہ زندہ رہتی اور آگے بڑھتی ہے۔ جو ان کی خلاف ورزی کرتی ہے، وہ زوال پذیر ہوکر رفتہ رفتہ تباہ ہوجاتی ہے۔ قرآن نے وہ قوانین بیان کئے ہیں جن سے قوموں کا عروج وزوال وابستہ ہے، اور ان کی صداقت کے ثبوت کے لئے، اقوامِ سابقہ کی سرگذشتوں کو بطورِ شہادت پیش کیا ہے۔ یعنی اس نے کہا ہے کہ دیکھو! فلاں قوم نے اپنے ہاں اس قسم کا نظام قائم کیا تو اسے زندگی کی شادابیاں اور خوشگواریاں حاصل ہوگئیں اور فلاں قوم نے اس کی مخالفت کی تو وہ تباہ وبرباد ہوگئی اور اس کے بعد، وہ قومِ مخاطب اور آنے والی اقوامِ عالم سے کہتا ہے کہ ان قوانین اور ان کی صداقت کے ثبوت میں پیش کردہ ان شواہد کی روشنی میں تم خود فیصلہ کرلو کہ تم زندہ اور پائندہ رہنا چاہتے ہو یا تباہ وبرباد ہونا۔ اگر زندہ وشاداب رہنا چاہتے ہو تو اپنا نظام، قوانینِ خداوندی کے مطابق متشکل کرو۔ اگر تباہ ہونا چاہتے ہو تو ان کے خلاف روش اختیار کرلو۔

دیدۂ عبرت کشا!

جس قسم کی تمہاری روش ہوگی، اسی قسم کا نتیجہ تمہارے سامنے آجائے گا۔ دیکھئے! وہ اس حقیقت کو کیسے واضح الفاظ میں سامنے لاتا ہے جب کہتا ہے کہ: اَفَلَمۡ یَسِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَیَنۡظُرُوۡا کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ ؕ (40:82) کیا یہ لوگ دنیا میں چلے پھرے نہیں کہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے کہ جو قومیں ان سے پہلے ہوگزری ہیں، اور انہوں

نے اسی قسم کی روش اختیار کر رکھی تھی جس پر یہ گامزن ہیں۔ تو ان کا انجام کیا ہوا؟ ان کی اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات کی ٹھیکریاں، ان کی عظمتِ گذشتہ کی درخشندہ داستانیں بھی بیان کرتی ہیں اور اس کے بعد ان کی تباہی و بربادی کی مرثیہ خواں بھی ہیں۔ كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْهُمْ وَاَشَدَّ قُوَّةً وَّاٰثَارًا فِي الْاَرْضِ (40:82) وہ قومیں تعداد میں بھی اس قوم سے زیادہ تھیں جو اب تمہاری مخاطب ہے، اور قوت و حشمت میں بھی اس سے بڑھ کر اُن کی شان و شوکت کے جھنڈے زمین میں گڑے ہوئے تھے۔ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (40:82) لیکن جب ان کے غلط نظام کے تباہ کن نتائج کے ظہور کا وقت آیا تو نہ ان کی تعداد کی کثرت ان کے کسی کام آسکی اور نہ ہی ان کی دولت و قوت انہیں اس تباہی سے بچا سکی۔ یہ تباہی ان پر اچانک نہیں آ گئی تھی، خدا نے ان کی طرف اپنے پیغامبروں کو بھیجا تا کہ وہ انہیں بتا دیں کہ جس راستے پر وہ چلے جا رہے ہیں وہ انہیں تباہی کے جہنم کی طرف لئے جا رہا ہے فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ (40:83) لیکن وہ لوگ اپنی دولت اور قوت کے نشے میں اس قدر بدمست اور اپنی ہنرمندیوں اور عیارانہ کارستانیوں پر اس قدر فرحاں اور نازاں تھے کہ انہوں نے ان پیغامبرانِ انقلابِ آسمانی کی تنبیہات کا مذاق اڑایا اور ان سے کہا کہ ہم نے جو نظام وضع اور اختیار کر رکھا ہے، اس سے ہمارے ہاں ہُن برس رہا ہے اور آپ کہہ رہے ہیں کہ ہم تباہیوں کی طرف بڑھے چلے جا رہے ہیں۔ آپ تشریف لے جائیے۔ ہم اپنے معاملات کو آپ سے بہتر سمجھتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد ہوا وہی جو اُن سے وہ آسمانی پیغام رساں کہتے تھے۔ اُنہیں اُن تباہیوں نے گھیر لیا جن کی وہ ہنسی اڑایا کرتے تھے۔ فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ (40:84) جب انہوں نے اس تباہی کو اپنے سامنے کھڑا دیکھا تو کہا کہ ہم نظامِ خداوندی کی صداقت پر ایمان لاتے ہیں اور جس نظام کو اس کا ہمسر ٹھہرایا کرتے تھے، اُسے مسترد کرتے ہیں۔ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا ۭ (40:85) لیکن جب تباہی سامنے آ کھڑی ہو تو اس وقت غلط روش سے اجتناب کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔ پھر اس قوم کی ہلاکت اٹل ہوتی ہے۔

یہ سنت اللہ ہے:

یہ بیان کرنے کے بعد کہا کہ یہ کوئی انوکھی بات نہ تھی جو صرف کسی ایک خاص قوم کے ساتھ مخصوص تھی۔ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ ۚ (40:85) یہ خدا کی اٹل روش ہے جو تمام اقوامِ سابقہ کے سلسلہ میں جاری و ساری رہی ہے۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (33:62)۔ اور تو خدا کی اس روش، اس قانونِ محکم میں، کبھی تبدیلی نہیں پائے گا۔ یہ اٹل اور غیر متبدل قانون ہے جس کے مطابق قوموں کی زندگی اور موت کے فیصلے ہوتے ہیں۔

اشتراکیت کا نظریۂ تاریخ:

آگے بڑھنے سے پہلے، ضمناً یہ بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ خود ہمارے دور میں، ایک اور گوشے سے بھی تاریخ

کی اہمیت کی آواز بلند کی گئی ہے اور وہ ہے مارکسزم کا گوشہ۔ اس کے پیش کردہ نظریۂ تاریخ کی تفصیل طول طویل ہے لیکن اس کا ملخص یہ ہے کہ ایک معاشی نظام پیدا ہوتا ہے، پروان چڑھتا ہے۔ جب وہ اپنے عہدِ شباب کو پہنچتا ہے تو اس میں سے ایک اور نظام نمودار ہو جاتا ہے جو اس پہلے نظام کی ضد ہوتا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد اس نظام کا بھی وہی حشر ہوتا ہے، جو اس سے ماسبق نظام کا ہوا تھا۔ انسان کی ساری تاریخ انہی تضادات کی باہمی کشمکش کی داستان ہے جس کو جدلیت (Dialecticism) کہا جاتا ہے۔ تضادات کی یہ کشمکش اس قدر پُرقوت اور مہیب ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ انسان اس کے ہاتھوں مجبور اور بے بس ہے۔ جب مارکسؔ سے پوچھا گیا کہ وہ کون سی ایسی قوّت ہے جو اس قدر اٹل اور شہ زور واقعہ ہوئی ہے، تو اس نے کہا کہ اس قوت کا نام تاریخی وجوب (Historical Necessity) ہے۔ یہ اصطلاح ایسی مبہم بلکہ موہوم ہے کہ آج تک کوئی بتا ہی نہیں سکا کہ اس سے بالآخر مفہوم کیا ہے۔ وہ شے ہے کیا جسے اس قدر مہیب اور لافانی قوّت حاصل ہے کہ دنیا کی کوئی قوت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ کوئی اس کا جواب نہیں دے سکا، نہ دے سکتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ مارکسؔ نے خدا اور اس کے قوانین کا انکار کیا تو اس سے اس کے تحت الشعور میں ایک خلا پیدا ہو گیا لیکن۔ خلا محال ہے فطرت کے کارخانے میں۔ اس لئے اسے اس خلا کو پُر کرنے کے لئے کسی قوت پر ایمان لانا ضروری تھا اس کے لئے اُس نے ''تاریخی وجوب'' کی ایک موہوم سی اصطلاح وضع کر لی اور اس طرح اپنے لاشعوری خلا کو پُر کر لیا۔ یہ حقیقت بادنیٰ تعمق سمجھ میں آجائے گی کہ کاروانِ انسانیت جن راستوں سے گزرا ہے، تاریخ ان کے ریکارڈ کا نام ہے اور بس۔ اس ریکارڈ کو کون سی قوت حاصل ہو سکتی ہے! یہ ریکارڈ ہمیں یہ بتا سکتا ہے کہ فلاں دور میں کس قسم کے ذرائع پیداوار اختیار کئے گئے اور فلاں زمانے میں کس قسم کا معاشی نظام رائج کیا گیا، اور اس کا نتیجہ کیا برآمد ہوا۔ تاریخ، بہرحال انسانی سعی و کاوش اور فکر و عمل کا ریکارڈ ہے اور ریکارڈ کو کوئی قوت حاصل نہیں ہوتی۔

اشتراکیت میں تاریخ کا ایک اور تصور بھی ہے جو اس سے بھی کہیں زیادہ گمراہ کن ہے۔ اسے کہتے ہیں تاریخ کی مادی تعبیر (The Materialist Concept of History) اس تصور کی رُو سے کہا یہ جاتا ہے کہ انسانی تاریخ میں جس قدر ٹکراؤ سامنے آتے رہے، ان کا جذبۂ محرکہ محض معاشی (یعنی مادی مفاد کا تصادم) تھا۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ انسان کے سامنے مسئلہ سارا روٹی کا ہے۔ اس کے سوا کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ حق و باطل، خیر و شر، ہدایت و ضلالت، نیکی بدی وغیرہ کے تصورات یا امتیازات سب واہمہ ہیں۔ انگلزؔ (Engels) اس باب میں لکھتا ہے:

> تاریخ کے مادی تصور کی ابتداء اس اصول سے ہوتی ہے کہ پیداوار اور پیداوار کے ساتھ اس کی تقسیم ہی سوسائٹی کے ہر نظام کی بنیاد ہوتی ہے۔۔۔ اس تصور کی رو سے، ہر تمدنی تغیر یا سیاسی انقلاب کی علت العلل۔ اس کے بنیادی اور اصلی سبب کو، لوگوں کے دلوں کے اندر، یا خارجی حق و صداقت اور عدل

وانصاف کے متعلق ان کی بڑھتی ہوئی بصیرت میں تلاش نہیں کرنا چاہئے۔ اس کے لئے دیکھنا یہ چاہئے کہ ان لوگوں نے پیداوار اور اس کی تقسیم کے طریقوں میں کیا تبدیلیاں کی تھیں۔ بالفاظِ دیگر ان تصادمات اور انقلابات کے بنیادی سبب کو ان کے فلسفۂ زندگی (یا نظریۂ حیات) میں تلاش نہیں کرنا چاہئے۔ اُس دور کی اقتصادیات میں تلاش کرنا چاہئے۔ (Anti Duhring - Page.300)

جہاں تک آئیڈیالوجی (یا نظریۂ حیات) کا تعلق ہے، انگلز لکھتا ہے کہ:

(اس میں شبہ نہیں کہ) آئیڈیالوجی کو نام نہاد مفکر، شعوری طور پر عمل میں لاتا ہے۔ لیکن اس کا یہ شعور جھوٹا (False Consciousness) ہوتا ہے۔ اس کے عمل کے حقیقی محرکات اس کی نگاہوں سے اوجھل رہتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس کا عمل مبنی برنظریہ کہلا ہی نہ سکے۔ لہٰذا وہ جھوٹے یا سطحی محرکات کو حقیقی محرکات تصور کر لیتا ہے۔

(Marx - Engels Correspondence, Page. 510-511)

یعنی جنہیں ہم حق و باطل کی لڑائیاں یا تضادات کہتے ہیں، وہ حق اور باطل کی لڑائیاں نہیں تھیں، وہ درحقیقت معاشی لڑائیاں تھیں۔ حق کی خاطر لڑنے والے مصلحین، حتیٰ کہ حضرات انبیاء کرامؑ (معاذ اللہ) خود فریبی میں مبتلا تھے جو اسے حق و باطل کا تصادم سمجھ لیتے تھے۔ ان کا حقیقی جذبۂ محرکہ معاشی ہی ہوتا تھا جو شعوری طور پر ان کی نگاہوں سے اوجھل رہتا تھا۔

یہ ہے اشتراکیت کا سب سے اہم نظریۂ تاریخ۔ لیکن جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، قرآن کا نظریۂ تاریخ اس کے بالکل برعکس ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تاریخ مختلف نظریاتِ حیات کی کشمکش کا ریکارڈ ہے۔ جو نظریہ قوانینِ خداوندی کے مطابق ہو، اسے کامیابی حاصل ہوتی ہے جو ان کے خلاف ہو وہ شکست کھا جاتا ہے۔ تاریخ کا ریکارڈ قرآن کے اس دعویٰ کی صداقت کی شہادت پیش کرتا ہے۔ اس میں خود کوئی قوت نہیں ہوتی۔ قوت، قانون میں ہوتی ہے، قانون کی سرگذشت میں نہیں۔ اقوامِ سابقہ کی ان سرگذشتوں کو بھی قرآن نے داستان گوئی کے لیے بیان نہیں کیا۔ وہ اپنی مخاطب قوم سے (یعنی ہر زمانے کی اقوام سے) یہ کہتا ہے کہ ان اقوامِ سابقہ کے انجام وعواقب کو سامنے رکھ کر، تم اپنے لئے آپ فیصلہ کر لو۔ جس قوم کی روش تم اختیار کرو گے اسی قوم جیسا انجام تمہارا ہو جائے گا۔

قرآنِ کریم نے اس سلسلہ کا آغاز قوم (حضرت) نوحؑ سے کیا ہے اور مختلف اقوام کی سرگذشتیں بیان کرتا، عہدِ نبی اکرم ﷺ تک پہنچ گیا ہے۔ اس خطاب میں بتایا جائے گا کہ قرآنِ کریم نے وہ کون سے جرائم (یعنی غلط نظام) بتائے ہیں جن کی وجہ سے یہ قومیں تباہ و برباد ہوئیں، اور مقصد اس سے یہ ہے کہ اس کے بعد ہم دیکھیں کہ کیا ہم بھی قومی حیثیت سے انہی جرائم کے مرتکب تو نہیں ہو رہے!

تمہیدی وضاحت:

اس سلسلہ میں دو اہم امور کا تذکرہ ضروری ہے۔ ایک تو یہ کہ غلط روش پر چلنے والی قوم میں مختلف قسم کی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں لیکن قرآنِ کریم ان تمام خرابیوں کا ذکر نہیں کرتا۔ اس میں سے صرف اس بنیادی خرابی کا ذکر نمایاں طور پر کرتا ہے جو اس نظام کی اصل اور بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے اور باقی خرابیاں جس کے برگ و بار ہوتے ہیں۔ خدا کا رسول بھی سب سے زیادہ زور اُسی بنیادی خرابی کے ازالہ پر دیتا، اور اُسی کو اُن کی تباہی کا موجب بتاتا ہے۔ ان اقوام کی سرگذشت کے بعد جب ان بنیادی جرائم کی فہرست ہمارے سامنے آئے گی تو یہ حقیقت واضح طور پر منکشف ہو جائے گی کہ قومیں کس قسم کے جرائم یا غلط نظریاتِ زندگی کہ وجہ سے تباہ ہوتی ہیں۔ واضح رہے کہ اصل چیز نظریۂ زندگی یا نظامِ حیات ہے۔ جرائم درحقیقت غلط نظریہ یا تخریبی نظام کا منطقی نتیجہ ہوتے ہیں۔

اور یہیں سے وہ دوسری بات ہمارے سامنے آجاتی ہے جس کا ذکر کرنا ضروری قرار دیا گیا ہے اور وہ یہ کہ تباہ ہونے والی قوم میں یہ نہیں ہوتا کہ اس میں کوئی فرد بھی ایسا نہیں ہوتا جس میں خوبیاں یا اچھائیاں نہ ہوں۔ اس میں اچھے افراد بھی ہوتے ہیں کہ: وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ۚ (8:25) اس فتنے سے بچتے رہو جو جب آتا ہے تو صرف انہی لوگوں کو اپنی لپیٹ میں نہیں لیا کرتا جنہوں نے ظلم و جرائم کئے ہیں۔ وہ سب کو بہا کر لے جایا کرتا ہے۔ جب دریا کے بند احتیاط سے نہ باندھنے کی وجہ سے سیلاب آجاتا ہے تو وہ صرف انہی کے گھروں کو تباہ نہیں کرتا جو اس تساہل یا تغافل کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ وہ بستیوں کی بستیاں تباہ کر کے رکھ دیا کرتا ہے۔ لہٰذا دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ کوئی قوم اپنے ہاں نظام کس قسم کا رائج کرتی ہے۔ غلط نظام میں بسنے والے وہ افراد بھی تباہی سے نہیں بچ سکتے جنہوں نے انفرادی طور پر کوئی جرم نہ کیا ہو۔ اس سے وہی لوگ بچ سکتے ہیں جو اس نظام کو مسترد کر کے یا تو اس کی جگہ صحیح نظام قائم کریں، یا ان لوگوں سے الگ ہو کر، کسی ایسی جگہ چلے جائیں جو صحیح نظام کے قیام کے لئے سازگار ہو۔ اسے دین کی اصطلاح میں ہجرت کہا جاتا ہے جو قریب ہر رسولؑ کا شیوہ رہا ہے۔

اس تمہید کے بعد، ہم ان اہم اقوام کی سرگذشتوں کی طرف آتے ہیں جنہیں قرآنِ کریم نے نمایاں طور پر بیان کیا ہے۔

قومِ حضرت نوح علیہ السلام:

قرآنِ کریم نے اقوامِ سابقہ کی سرگذستوں کے سلسلہ کا آغاز قومِ نوح علیہ السلام سے کیا ہے۔ یہ ملحوظ رہے کہ قرآنِ کریم تاریخ کی کتاب نہیں، اس لئے وہ ان اقوام کے زمان و مکان کے متعلق گفتگو نہیں کرتا۔ وہ اپنے آپ کو مقصد پیشِ نظر تک محدود رکھتا ہے یعنی اس حقیقت تک کہ اس قوم نے اپنے ہاں معاشرہ کس قسم کا قائم کر رکھا تھا۔ اس معاشرہ کی نمایاں خرابیاں کیا تھیں،

اوراس کا نجام کیا ہوا۔

پھر یہ بھی واضح رہے کہ قرآنِ کریم نے اس سلسلہ میں صرف انہی اقوام کا ذکر کیا ہے جن کے احوال وکوائف سے اُس کی اولین مخاطب (عرب) قوم اچھی طرح واقف تھی۔ اوراسے کرنا بھی یہی چاہئے تھا۔ مثلاً اگر وہ یہ کہتا کہ دیکھو! پارتھین قوم نے یہ کیا اوراس کا انجام یہ ہوا، تو قومِ مخاطب سب سے پہلے یہ سوال لے اٹھتی کہ پارتھین قوم کون تھی، کہاں تھی، ان کی تباہی کیسے ہوئی اور کیا معلوم یہ کچھ ہوا بھی یا نہیں؟ یہ سلسلۂ بحث وتمحیص شروع ہوجاتا اور اصل مقصد اسی الجھاؤ میں کھو جاتا۔ وہ جن اقوام کا ذکر کرتا ہے ان کی داستانیں، قومِ مخاطب (عربوں) کے ہاں عام تھیں، اوران کی اُجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات، ان کے گردوپیش اور ان کی مسافرت کے راستوں میں بکھرے پڑے تھے۔ یعنی وہ اقوام جن کے متعلق وہ کہتا ہے کہ: یَمۡشُوۡنَ فِیۡ مَسٰکِنِہِمۡ ؕ (20:128) جن کی بستیوں میں یہ لوگ چلتے پھرتے ہیں۔ ان اقوام کی سرگذشتوں سے وہ اچھی طرح واقف تھے۔ قرآن نے فقط اتنا بتایا کہ ان کا یہ انجام کیوں ہوا، اوراگر تم بھی وہی کچھ کروگے تو تمہارا انجام بھی ویسا ہی ہوگا۔

آغاز داستانِ قومِ نوح علیہ السلام:

کہا یہ جارہا تھا کہ قرآنِ کریم نے اس سلسلہ کا آغاز قومِ نوح علیہ السلام کی سرگذشت سے کیا ہے۔ تاریخی قیاسات کا رُخ اس طرف ہے کہ یہ قوم دجلہ اورفرات کی وادیوں میں بستی تھی اوران کا زمانہ کوئی چار پانچ ہزار سال قبل مسیح کا تھا۔ قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ وہ قوم، زمانہ قبل از تاریخ کی دیگر اقوام اور قبائل کی طرح' بت پرست تھی۔ ہنوز تمدن کی اس سطح پر بھی نہیں پہنچی تھی جہاں اتنا بھی معلوم ہو کہ سیلاب کی تباہی سے بچنے کے لئے کشتی بنائی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح ؑ کو کشتی بنانے کی ترکیب بھی بذریعہ وحی بتائی تھی۔ اور جب وہ لوگ انہیں کشتی بناتے دیکھتے تو ان کا مذاق اڑاتے تھے۔ جو رسوم ورواج اور زندگی کے طور طریق انہیں آباء واجداد سے وراثت میں ملے تھے، انہیں بے حد مقدس سمجھتے اوران پر شدت سے کاربند رہتے تھے۔ وہ ان کے خلاف ایک لفظ تک سننا گوارا نہیں کرتے تھے، خواہ وہ کتنا ہی دلائل وبراہین پر مبنی کیوں نہ ہو۔

طبقاتی امتیازات:

اس قوم کی علمی، ذہنی اور تمدنی سطح تو یہ تھی، لیکن معاشرہ میں طبقاتی امتیازات بڑی اہمیت اختیار کرچکے تھے اور یہی اُس معاشرہ کی سب سے بڑی خرابی تھی جسے قرآن نے نمایاں طور پر بیان کیا ہے اور جس کے نتیجہ میں وہ قوم تباہ ہوگئی۔ قرآنِ کریم کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ: وَلَقَدۡ کَرَّمۡنَا بَنِیۡۤ اٰدَمَ (17:70) تمام انسان بنیادی طور پر یکساں واجب التکریم ہیں پیدائش کے لحاظ سے انسانی بچوں میں کسی قسم کی تفریق نہیں کی جاسکتی۔ معاشرہ میں مدارج کا تعین جوہر ذاتی اور حسنِ سیرت وکردار کی رُو سے ہوگا، نہ کہ حسب نسب، پیشہ یا دولت کے معیار کے مطابق، یہ تھی وہ بنیادی قدر جسے حضرت نوح ؑ نے پیش کیا اور جس

کی مخالفت، اور سخت مخالفت، اکابرینِ قوم کی طرف سے ہوئی۔

مخالفت ملاءِ قوم کی طرف سے:

اس مقام پر ایک اور بنیادی نکتہ کا سمجھ لینا بھی ضروری ہے۔ قرآنِ کریم نے ہر رسولؑ کے سلسلہ میں کہا ہے کہ اس کے انقلابی پیغام کی مخالفت، سب سے پہلے ملاءِ قوم نے کی۔ اس میں قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (7:66) کے الفاظ اس تکرار و اصرار سے آتے ہیں کہ ایک پارہ (نویں پارہ) کا عنوان ہی قَالَ الْمَلَاُ ہے۔ اس کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے ''سردارانِ قوم'' عرفی اعتبار سے یہ ترجمہ صحیح ہے۔ لیکن مادہ کے لحاظ سے اس کے معنی ہیں وہ لوگ جن کے برتن ضروریات زندگی کے سامان سے ہر وقت بھرے رہیں۔ یعنی قوم کا دولت مند، خوشحال طبقہ انہی کو قرآن نے دیگر مقامات پر مترفین کہہ کر پکارا ہے۔ یعنی وہ لوگ جو دوسروں کی کمائی پر عیش و آرام کی زندگی بسر کریں۔ جنہیں زندگی کی آسائشیں بافراط حاصل ہوں۔ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ جب اور جہاں بھی آسمانی انقلاب کی آواز بلند ہوئی، قوم کے دولت مند، سرمایہ پرست طبقہ نے سب سے پہلے اور سب سے بڑھ کر اس کی مخالفت کی، اور ان کی تائید و حمایت مذہبی پیشوائیت کی طرف سے ہوئی۔ چنانچہ حضرت نوحؑ نے جب اپنی قوم سے کہا کہ جو غلط نظریات اور مسالک تمہارے معاشرہ میں عام ہو رہے ہیں ان کی جگہ قوانینِ خداوندی کی اطاعت اختیار کرو۔ تو فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ (11:27)۔ تو اس قوم کے اکابرین نے جن کے ہاں دولت کی افراط تھی اور اس وجہ سے انہوں نے صحیح مسلکِ زندگی سے انکار اور سرکشی کی راہ اختیار کر رکھی تھی، اس سے کہا کہ: مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ ۚ (11:27) تم ہمیں کس بات کی دعوت دیتے ہو؟ ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے معاشرہ کے نہایت پست درجہ کے، کمینے اور رذیل لوگ تمہارے پیچھے لگ گئے ہیں۔ نہ انہیں عقل ہے نہ فکر۔ اس لئے وہ بلا سوچے سمجھے تمہارے ساتھ ہوئے ہیں اور تم اس فریب میں مبتلا ہو گئے ہو کہ تمہاری دعوت حق و صداقت پر مبنی، اور تمہاری پکار بڑی جاذب ہے۔ تم کہیں پاگل تو نہیں ہو گئے (26:16) وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ (11:27) ذرا بتاؤ تو سہی کہ تمہیں اور تمہارے ان ساتھیوں کو ہمارے مقابلہ میں کون سی فضیلت حاصل ہے جو ہم اس جماعت میں شامل ہو جائیں۔

اس کے جواب میں حضرت نوحؑ نے کہا کہ جو کچھ میں تم سے کہہ رہا ہوں، اسے سوچو اور سمجھو۔ اسے دیکھو اور پرکھو کہ وہ حق و صداقت پر مبنی ہے یا نہیں۔ یہ نہ دیکھو کہ جن لوگوں نے اسے قبول کیا ہے، ان کا پیشہ کیا ہے وَمَا عِلْمِيْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۚ (26:112) میری نگاہ ان کی سیرت و کردار پر ہے۔ اس سے مجھے کچھ سروکار نہیں کہ وہ کام کاج کیا کرتے ہیں۔ جس معاشرہ کی تشکیل کی میں دعوت دیتا ہوں اس میں معیارِ تکریم و تعظیم، کردار کی بلندی اور جوہر ذاتی کی گراں مائیگی ہوتا ہے نہ کہ حسب و نسب کی تفریق اور ذاتوں اور پیشوں کی تمیز، حسب و نسب کی تفریق انسانی انانیت کا خود ساختہ امتیاز ہے اور پیشوں

کا فرق، معاشرہ میں تقسیم کار کا فطری نتیجہ۔ لہٰذا، ان امور کو شرفِ انسانیت سے کیا واسطہ؟ اگر ایک محنت کش مزدور، کیریکٹر کے اعتبار سے بلند ہے تو وہ اس صاحب ثروت سے ہزار درجہ بہتر ہے جس کا کردار پست ہے۔

اس پر ان اکابرینِ قوم نے کہا: قَالُوْا یٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا (11:32) اے نوح! ہم نے دیکھ لیا کہ تم بہت جھگڑالو واقعہ ہوئے ہو۔ تم نے بہت لمبی چوڑی باتیں کرلیں اور ہم نے سن لیں۔ اس بحث وتمحیص سے کچھ حاصل نہیں۔ ایک فیصلہ کن بات سُن لو۔ وہ یہ کہ ان ذلیل اور کمینے لوگوں کو اپنی جماعت سے نکال دو۔ اس کے بعد ہم تمہارے ساتھ ہوجائیں گے۔ ہم ان کے ساتھ بیٹھنے کے لئے تیار نہیں۔ یہ بھی بھلا کوئی بات ہوئی کہ قوم کے اشراف واجلاف، رؤساوغرباء، اور سرمایہ دار اور محنت کش، ایک ہی صف میں کھڑے ہوجائیں؟ اس کے جواب میں حضرت نوحؑ نے ان متکبرین سے کہا کہ تمہارا مطالبہ یکسر باطل اور بے ہودہ ہے۔ دعوتِ خداوندی کی رُو سے انسانوں کی وجۂ جامعیت واخوت ایمان ہے۔ وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِيْنَ۝۱۱۴ (26:114) میں تمہاری خاطر، ان لوگوں کو جو اس کی دعوت کی صداقت پر ایمان لا چکے ہیں، دھتکار نہیں سکتا۔ وَيٰقَوْمِ مَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ طَرَدْتُّهُمْ ؕ (11:30) اگر میں انہیں دھتکاروں، تو تم تو بے شک خوش ہوجاؤ گے، لیکن بتاؤ کہ اس جرم عظیم کی پاداش سے، جو خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی رُو سے مجھے ملے گی، مجھے کون بچا سکے گا؟ اگر میں نے ایسا کیا تو اِنِّيْٓ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ (11:31)، تو میں بھی انہی لوگوں میں سے ہوجاؤں گا جو غریبوں اور مفلسوں کو نفرت وحقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ یہ تو بڑا ظلم ہوگا۔ میں اس کا مرتکب نہیں ہوسکتا۔

اس پر انہوں نے کہا کہ اے نوحؑ! تم اگر اس کے لئے آمادہ نہیں ہوتو اسے اچھی طرح سن رکھو کہ ہم تمہاری ان حرکتوں کو زیادہ دیر تک برداشت نہیں کرسکتے۔ تم ان ادنیٰ اور رذیل لوگوں کو سر پر چڑھا کر، طبقاتی امتیازات کو مٹانے کا خیال عام کررہے ہو۔ یہ بہت بڑا فتنہ ہے۔ اس سے معاشرہ میں فساد برپا ہوجائے گا۔ ہم اس کی اجازت نہیں دے سکتے۔ قَالُوْا لَىِٕنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰنُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ۝۱۱۶ (26:116) اگر تم اس فتنہ پردازی سے باز نہ آئے تو ہم تمہیں سنگسار کردیں گے۔

چنانچہ انہوں نے حضرت نوحؑ اور ان کی جماعت کے خلاف پراپیگنڈا کا ایک منصوبہ تیار کیا جس میں مذہبی پیشوائیت ان کا مؤثر ترین آلۂ کار تھی۔ وجۂ مخالفت تو وہ تھی جس کا اوپر ذکر آچکا ہے۔ لیکن مذہبی پیشوائیت ہر فتنہ کو مذہب کا رنگ دیکر عوام کے جذبات کو مشتعل کرتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے ڈگڈگی بجانی شروع کردی کہ: تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا (14:10)۔ لوگو! دیکھو! یہ نیا فتنہ اٹھا ہے یہ تمہیں تمہارے اسلاف کے مذہب سے منحرف کرانا چاہتا ہے۔ یہ ان معبودوں کی مخالفت کرتا ہے جنہیں تمہارے آباء واجداد پوجتے چلے آئے ہیں۔ امیر اور غریب کا فرق خدا کا پیدا کردہ ہے۔ معزز اور ذلیل کی تفریق پیدائشی ہے۔ یہ ان امتیازات کو مٹا کر مساوات کی غیر فطری دعوت دیتا ہے۔ یہ کفر ہے یہ الحاد ہے۔ یہ

بالکل انوکھی بات ہے۔ مَّا سَمِعۡنَا بِهٰذَا فِىۡۤ اٰبَآئِنَا الۡاَوَّلِيۡنَ ۚ (23:24) ہم نے اس قسم کی باتیں اپنے آباء واجداد سے کبھی نہیں سنیں۔ یہ بہت بڑا فتنہ ہے۔ تم اٹھو اور اس فتنہ کا سر کچل کر رکھ دو۔

یہ تھا وہ مقام جہاں حضرت نوحؑ نے (قرآنِ کریم کے الفاظ میں) اپنے رب کو پکارا اور کہا تھا کہ اس قوم کے سعادت مند افراد نے حق وصداقت کی دعوت کو قبول کر لیا ہے۔ اس کے باقیماندہ افراد میں اصلاح کا کوئی امکان نہیں۔ لہٰذا، انہیں تباہ ہو جانا چاہئے۔ اس کے لئے انہوں نے دلیل بڑی وقیع دی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ اگر معاشرہ کی یہ خرابی انہی موجودہ افراد تک محدود ہوتی تو اسے برداشت کر لیا جاتا۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ جو نسل ان سے آگے چلے گی وہ بھی انہی نظریات کی حامل اور اسی اندازِ معاشرت کی علمبردار ہوگی۔ اس طرح یہ وجہِ تفریق انسانیت انداز معاشرہ نسلاً بعد نسل آگے بڑھتا چلا جائے گا اور یہ روش عالمگیر ہو جائے گی۔ اس لئے رَّبِّ لَا تَذَرۡ عَلَى الۡاَرۡضِ مِنَ الۡكٰفِرِيۡنَ دَيَّارًا (71:26) بارالٰہا! ان لوگوں کا نام ونشان تک مٹا دے۔ اِنَّكَ اِنۡ تَذَرۡهُمۡ يُضِلُّوۡا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوۡۤا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا (71:27) اگر ان لوگوں کو علیٰ حالہٖ چھوڑ دیا گیا تو یہ دوسرے لوگوں کو بھی گمراہ کریں گے اور ان کی آنے والی نسل بھی، جو انہی کی گود میں پروان چڑھے گی، انہی نظریات کی حامل ہوگی۔

معیارِ قومیت:

یہ تھا وہ جرمِ عظیم جس کی پاداش میں وہ قوم تباہ ہوگئی۔ ان تباہ ہونے والوں میں خود حضرت نوحؑ کا بیٹا بھی تھا۔ اس سلسلہ میں قرآن ایک اور نکتہ کو سامنے لایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوحؑ سے وعدہ کیا تھا کہ یہ قومِ سرکش تو غرق ہو جائے گی لیکن میں ''تیرے اہل'' (یعنی تیرے اپنوں کو) بچا لوں گا، جب حضرت نوحؑ نے دیکھا کہ ان کا بیٹا بھی غرق ہونے والوں کے زمرے میں شامل ہے تو انہوں نے کہا کہ بارالٰہا! تو نے وعدہ کیا تھا کہ تو میرے اہل کو بچا لے گا۔ تو بیٹے سے بڑھ کر اہل کون ہو سکتا ہے۔ اسے کیوں نہیں بچایا جاتا؟ اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب ملا کہ اے نوح! یہ تیری بھول ہے جو تو اس لڑکے کو، محض اس بنا پر کہ اس کے ساتھ تیرا خون کا رشتہ ہے، اپنے اہل میں سے سمجھتا ہے۔ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيۡرُ صَالِحٍ (11:46) اس کے اعمال وکردار معیارِ خداوندی کے مطابق نہیں۔

یہاں قرآن نے، اپنے اور بیگانے، کا ایسا بنیادی اصول بیان کر دیا ہے، جو اسلامی نظریۂ قومیت کی اساس قرار پا گیا۔ یعنی (حضرت) نوحؑ کا بیٹا، خون، رنگ، زبان، وطن کے اشتراک کے باوجود، اپنوں میں سے قرار نہ پایا۔ اپنوں میں سے وہی سمجھے گئے جو ایمان کے رشتے میں مشترک تھے۔ دوسرے مقام پر کہا گیا ہے کہ حضرت نوحؑ کی بیوی بھی چونکہ ایمان میں شریک نہ تھی اس لئے وہ غیر قرار دے دی گئی۔

قرآنِ کریم نے اپنے بلند، عالمگیر، غیر متبدل اصولوں کی صداقت کے لئے جس قوم کی سرگذشت سے آغازِ داستان کیا،

اس میں بتایا یہ گیا ہے:

(1) جس قوم میں طبقاتی ناہمواریاں پیدا ہو چکی ہوں، جہاں اشراف اور رذائل کی تفریق پیدائش کی رُو سے کی جائے، جس میں عزت کا معیار دولت ہو، جس میں عام پیشوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا جائے، جس میں رَوساء اسے برداشت نہ کر سکیں کہ مفلس اور غریب ان کے برابر بیٹھ جائیں۔

(2) جس قوم کا مسلک یہ ہو کہ جو کچھ اسلاف سے ہوتا چلا آ رہا ہے، اس پر غور و فکر کرنا کفر و الحاد ہے، اور

(3) جس قوم میں معیارِ قومیت، رنگ، نسل، خون، وطن، زبان کا اشتراک ہو نہ کہ ایمان کا رشتہ۔

وہ قوم آخر الامر تباہ ہو کر رہتی ہے۔ اب آگے بڑھیے۔

لیکن آگے بڑھنے سے پیشتر، ایک اور اہم بنیادی نکتہ کو بھی سامنے رکھیئے۔ جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے، ایک رسول جس قوم کی طرف آتا تھا اس میں ہر قسم کی خرابیاں پائی جاتی تھیں، لیکن ان میں ایک خرابی، اساسی اور بنیادی حیثیت رکھتی تھی۔ اس رسولؑ کا مقصد صرف اس ایک خرابی کا ازالہ نہیں ہوتا تھا۔ وہ اس معاشرہ کو تمام خرابیوں سے پاک اور صاف کرنا چاہتا تھا۔ اس کے لئے وہ کوئی خارجی علاج تجویز، یا میکانکی طریق کار اختیار نہیں کرتا تھا۔ وہ اس قوم کو اصولی تعلیم دیتا تھا جس سے ان کا انداز نگاہ بدل جائے اور اس طرح ان کا معاشرہ ان خرابیوں سے پاک ہو جائے۔ یہ اصولی تعلیم کیا تھی؟ قرآن نے اسے دو لفظوں میں بیان کر دیا ہے اور کہا ہے کہ ہر رسول، اپنی قوم کو یہی دعوت دیتا تھا۔ وہ دعوت کیا تھی! یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ (11:50) اے میری قوم کے لوگو! تم صرف قوانینِ خداوندی کی اطاعت، محکومی، فرمان پذیری اختیار کرو۔ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ؕ (11:26) اس کے سوا کسی اور کے احکام، قوانین کی اطاعت نہ کرو۔ یہ تھا ان کی ساری خرابیوں کا علاج، مع اس بنیادی خرابی کے جس کی طرف وہ ان کی توجہ خاص طور پر مبذول کراتا تھا۔ یاد رکھیئے۔ قرآنِ کریم چیچک کا علاج ہر آبلہ پر پھاہا رکھنے سے نہیں کرتا۔ اس سے مرض کا ازالہ ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ علاماتِ مرض کے بجائے علتِ مرض کا ازالہ کرتا ہے اور جب علت کا ازالہ ہو جاتا ہے تو علامات خود بخود مفقود ہو جاتی ہیں۔ وہ کہتا یہ ہے کہ قوموں کی زندگی میں سیاسی، معاشی، معاشرتی، اخلاقی، تمدنی، حتیٰ کہ انفرادی خرابیاں الگ الگ نہیں ہوتیں۔ وہ برگ و بار ہوتی ہیں غلط نظامِ زندگی کا۔ لہٰذا، ان کا علاج بھی الگ الگ نہیں ہو سکتا۔ اُس غلط نظام کی جگہ صحیح نظام (جو وحیٔ خداوندی پر مبنی ہو) نافذ کر دینے سے ہو سکتا ہے۔ یہی خدا کا تجویز کردہ علاج ہے اور یہی آسمانی انقلاب لانے والے حضرات انبیاء کرامؑ کا طریقِ کار تھا۔ اسی طریق کو اسلامی نظام کہا جاتا ہے۔

بہرحال، ہم نے دیکھ لیا کہ قرآنِ کریم کے ابدی اصول کے مطابق، طبقاتی تفریق معاشرہ کی تباہی کا موجب ہوتی ہے۔ ضمناً قرآن نے تاریخی سرگذشتوں کے سلسلہ کی ابتداء اس سے کی ہے۔ اور یہ (نکتہ قابل غور ہے کہ) اس سلسلہ کی آخری کڑی میں بھی اسے دہرایا گیا ہے۔ یعنی حضور نبی اکرم ﷺ کی قوم (قریش) کے سرداروں نے بھی بعینہٖ یہی اعتراض کیا اور

انہیں بھی بعینہٖ یہی جواب دیا گیا۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے 2:56) لیکن یہاں قرآن نے اس واقعہ کے بیان کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ بتایا کہ اس امتیاز سے تباہی کیوں آتی ہے۔ فرمایا کہ: وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ (6:53) یعنی یہ طبقات ہمیشہ ایک دوسرے کے لئے فتنہ اور مصیبت کا موجب بنتے ہیں۔ زمانہ نزولِ قرآن تک یہ بات تو ہر ایک کی سمجھ میں آسکتی تھی کہ بالادست طبقہ کس طرح زیردست طبقہ کے لئے مصیبتوں کا موجب ہوتا ہے۔ وہ ان پر کیسے کیسے ظلم وستم کرتا ہے۔ لیکن یہ بات بمشکل سمجھ میں آسکتی تھی کہ زیردست طبقہ بھی بالادست طبقہ کے لئے فتنہ کا موجب ہوسکتا ہے۔ یہ بات، اس زمانہ میں سامنے آئی ہے اور اب لوگوں نے محسوس کرنا شروع کر دیا ہے کہ طبقاتی امتیاز، نہ صرف زیردست طبقہ کے لئے باعثِ مصیبت ہے بلکہ یہ خود بالادست طبقہ کے لئے بھی فتنہ کا موجب ہے۔ قرآن نے یہ بات چودہ سو سال پہلے کہی تھی۔

یہ ہے داستانِ قومِ نوحؑ اب آگے بڑھیئے۔

قومِ عاد:

قومِ نوحؑ کے بعد، قرآن کریم، قومِ عاد کی سرگذشت سامنے لاتا ہے جس کی طرف حضرت ہود علیہ السلام مبعوث ہوئے تھے۔ مؤرخین کی تحقیق یہ ہے کہ یہ بڑی عظیم الشان قوم تھی جو ایک طرف یمن سے شروع ہو کر خلیج فارس کے ساتھ ساتھ عراق تک جا پہنچی تھی اور دوسری طرف عرب سے نکل کر، مصر و شام تک حکمران تھی۔ قریب دو اڑھائی ہزار سال قبل مسیح کے زمانے میں اس کا ستارہ عروج پر تھا۔ قرآنِ کریم نے بھی اس قوم کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچا ہے جس سے وہ (یوں سمجھئے گویا) موجودہ زمانے کی مغربی اقوام کے مماثل نظر آتی ہے۔ ایک طرف وہ قوت وحشمت اور مرفہ الحال اور فارغ البالی میں امتیازی حیثیت رکھتی تھی اور دوسری طرف علم وحکمت اور تہذیب وتمدن کے اعتبار سے بھی نمایاں مقام پر سرفراز تھی۔ قرآنِ کریم نے وَّزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْۜطَةً ۚ (7:69) کہہ کر ان کی مادی وسعتوں اور توانائیوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ الَّتِيْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ ۝ (89:8) کے اضافہ سے یہ بتایا ہے کہ اس کی ہمعصر اقوام میں کوئی اس کے ہمسر نہیں تھی۔ انہیں انعام وبنین اور جنات وعیون کی بخشائشیں بافراط حاصل تھیں (26:132-134) یعنی مال مویشی کی بھی کثرت، اور پرہ جنبہ بھی بہت وسیع، لہلہاتے باغات اور سرسبز وشاداب کھیتیاں بھی بکثرت اور چشموں کا آب مصفا بھی رواں دواں۔ یعنی اس زمانے کی دولت اور قوت تھی جو اُس قوم کو اس فراوانی سے حاصل تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس کی نمایاں خصوصیات یہ تھی کہ: وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّاَبْصَارًا وَّاَفْـِٕدَةً ۖ (46:26) انہیں سمع وبصر کی قوتیں بھی حاصل تھیں اور قلب ودماغ کی صلاحیتیں بھی۔ یعنی، اس زمانے کی علمی سطح کے مطابق، اشیائے فطرت کو مسخر کرنے اور ان سے مفید مطلب نتائج اخذ کرنے کی صلاحیتیں۔ دوسری جگہ کہا ہے کہ: وَكَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ (29:38) وہ جاہل اور بے بصر قوم نہیں تھی۔ دانا وبینا تھی۔ علم وہنر سے بہرہ یاب تھی۔ ان کی

تمدنی زندگی کا یہ عالم تھا کہ وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ ﴿129﴾ (26:129) وہ ایسے محکم قلعے اور سنگین حصار بناتے تھے گویا انہیں اس سرزمین پر ہمیشہ حکومت کرنی ہے۔ یہاں تک کہ اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ ﴿128﴾ (26:128) وہ پہاڑیوں کی چوٹیوں پر اپنی یادگاریں تعمیر کرتی تھیں ضمناً، یہاں قرآنِ کریم نے ایک لفظ کے اضافہ سے ان کی یادگاروں پر ایسی گہری تنقید کی ہے جس کی زد انہی کی یادگاروں تک محدود نہیں بلکہ وہ ایک حقیقتِ ثابتہ بن کر سامنے آتی ہے جس کا اطلاق ہر زمانے اور ہر قوم کی یادگاروں پر یکساں طور سے ہوتا ہے۔ اُس نے کہا ہے کہ وہ ایسی یادگاریں بناتے تھے جن کا افادی پہلو کوئی نہیں تھا۔ اس سے محض ان کی انانیت کا اظہار مقصود ہوتا تھا۔ مثلاً بڑے بڑے اونچے مینار یا محکم سنگین اور فولادی چٹانیں، جن پر صرف تو اتنا زیادہ ہو لیکن قوم یا انسانیت کو اُن سے فائدہ کچھ نہ پہنچے۔ یعنی محض خودنمائی کی خاطر عبث و بے کار اسراف!

قوم المجرمین:

قرآنِ کریم نے اس قوم کے جرائم کی تفصیل نہیں بتائی۔ لیکن اس نے جو کچھ اجمالاً کہا ہے اس میں ساری تفاصیل سمٹ کر آ گئی ہیں۔ اس نے کہا ہے کہ وہ قوم المجرمین تھی۔ عربی زبان میں جرم کہتے ہیں کسی کے درخت کا پھل کاٹ کر اور توڑ کر اپنے ہاں لے آنا۔ بھیڑ کی اون مونڈ لینا۔ آپ دیکھئے کہ اس ایک نقطہ میں اس قوم کے نظام کا پورے کا پورا نقشہ کس طرح نگاہوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ یعنی ایسا نظام جس میں سلب و نہب استحصال (Exploitation) و استعمار، معمول ہو جس میں دوسروں کی محنت کی کمائی کو ہر ممکن حربہ سے لوٹ لیا جائے۔ جس میں کیفیت یہ ہو کہ:

اُمتے بر اُمتے دیگر چرد دانہ ایں می کارد، آں حاصل بُرد

محنت کوئی کرے، اس کا حاصل کوئی اور لے جائے اور وہ بھی اس طرح کہ: وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ ﴿130﴾ (26:130) وہ کمزوروں اور ناتوانوں کو اپنے پنجۂ استبداد میں اس طرح جکڑتے تھے کہ ان بیچاروں کی ہڈیاں تک ٹوٹ جاتی تھیں۔ ان کی گرفت اس قدر محکم ہوتی تھی کہ کوئی اس سے رستگاری حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ ان کے حکمران جَبَّارٌ عَنِيْدٌ تھے (11:59) بڑے ظالم اور جابر، بڑے سرکش اور متکبر۔ دوسری جگہ ہے: فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَقَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ؕ (41:15) انہوں نے ناحق ظلم و ستم پر کمر باندھ رکھی تھی اور نخوت اور تکبر کا یہ عالم تھا کہ وہ دھڑلے سے کہتے تھے کہ ہماری طرف کوئی آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔ جو اس کی جرأت کرے ہم اس کی آنکھ نکال دینگے ہماری قوت کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔ جو ہمارے راستے میں آئے گا ہم اُسے کچل کر رکھ دیں گے۔

حضرت ہود علیہ السلام:

یہ تھی وہ قوم جس کے ہاتھوں مظلوم و مقہور انسانیت پر عرصۂ حیات تنگ ہو چکا تھا۔ جب ان کے مظالم انتہا تک پہنچ گئے تو ان کی طرف حضرت ہود علیہ السلام مبعوث ہوئے۔ تاکہ انہیں اس روش سے باز رکھا جائے۔ انہوں نے آ کر ان سے کہا کہ تمہاری

اس روش کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوگا۔ تم اسے چھوڑ کر، قوانینِ خداوندی کا اتباع کرو۔ اس کے جواب میں قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖٓ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ سَفَاهَةٍ (7:66) اس قوم کے اکابرین نے کہا ۔ دیکھئے یہاں بھی وہی لفظ ''الْمَلَاُ'' آیا ہے۔ یعنی وہ جنہیں سامان زیست بھرپور حاصل تھا۔ انہوں نے نشۂ قوت میں بدمست ہوکر کہا کہ میاں (معاذ اللہ) ہوش کے ناخن لو، کیا بہکی بہکی باتیں کرنے لگے ہو۔ یہ نظام جس کا نتیجہ دولت وحشمت اور قوت وشوکت کی اس قدر فراوانیاں ہیں، کبھی تباہی و بربادی کی طرف نہیں لے جا سکتا۔ تم جاؤ اور اپنا کام کرو۔ قرآن کہتا ہے: وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ (8:48) ان پر جذبات اس قدر غالب آ چکے تھے کہ انہیں کوئی شے اپنے اصلی رنگ میں دکھائی ہی نہیں دیتی تھی۔ انہیں اپنا سیاہ نامۂ اعمال بھی نہایت درخشندہ اور مزین نظر آتا تھا۔ اب ظاہر ہے کہ جب ذہنیت ایسی ہو جائے تو پھر کسی ناصح کی نصیحت کو کون سنتا ہے؟ انہوں نے حضرت ہود علیہ السلام کی نصیحت وموعظت سے اعراض برتا، تکذیب کی، سرکشی پر اُتر آئے۔ اس کا نتیجہ تباہی تھا۔ اس تباہی کا نقشہ قرآن کریم نے بڑے عبرت انگیز انداز میں کھینچا ہے۔ کہا ہے کہ اے قوم مخاطب! تم جو اپنی قوت اور دولت پر اس قدر اترا رہے ہو، گوشِ ہوش سے سنو کہ وَلَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَآ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ (46:26) ہم نے انہیں ایسا تمکن وتسلط عطا کیا تھا، وہ قوت وسطوت بخشی تھی جو تمہیں بھی حاصل نہیں۔ پھر یہ بھی نہیں کہ وہ لوگ جاہل تھے اس لئے اپنی جہالت کی وجہ سے تباہ ہوگئے۔ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّاَبْصَارًا وَّاَفْـِٕدَةً (46:26) انہیں دیکھنے سننے کی صلاحیت اور سمجھنے سوچنے کی اہلیت عطا کی تھی۔ وہ دیدہ ور اور باشعور تھے، صاحبِ علم وہنر تھے۔ لیکن فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَآ اَبْصَارُهُمْ وَلَآ اَفْـِٕدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ (46:26) لیکن جب انہوں نے قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتی، مستقل اقدارِ سماوی سے اعراض برتا، ان کے مطابق نظام قائم کرنے سے انکار کیا تو ان کا علم وہنر کسی کام نہ آیا۔ ان کے سمجھنے سوچنے کی صلاحیتیں سب بیکار ثابت ہوئیں۔ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ (46:26) اور جس تباہی کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے اس نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا۔ وہ سب کچھ دیکھتے بھالتے ہلاک ہوگئے۔ انہیں ان کے غلط نظام کے تباہ کن نتائج سے کوئی چیز نہ بچا سکی۔ اور یہ بات کچھ انہیں سے مخصوص نہیں كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ (46:25)۔ ہر مجرم قوم کا انجام یہی ہوتا ہے۔ ان کی ہنرمندیاں انہیں اس تباہی سے بچا نہیں سکتیں۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

قومِ عاد کی سرگذشت سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آئی کہ خدا کے اٹل قانونِ مکافات کی رُو سے، وہ نظامِ زندگی جس میں دوسروں کی محنت کو لوٹا کھسوٹا جائے۔ جس میں کمزوروں اور ناتوانوں کو ہدفِ جور وستم بنایا جائے۔ جس میں سلب ونہب اور (Exploitation) قومِ غالب کا شعار ہو، وہ نظام کبھی قائم نہیں رہ سکتا۔ وہ نظام بھی نیست ونابود ہو جاتا ہے اور اس کے

ساتھ اس کی حامل قوم بھی تباہ و برباد۔ یہ خدا کا غیر متبدل قانون ہے، یہ اس کا اٹل فیصلہ ہے۔

آب آگے چلئے:

قومِ ثمود:

قدیم زمانے میں، حجاز سے جو شاہراہ شام کو جاتی تھی، اس پر، وادیٔ قریٰ میں، ایک نامور قوم آباد تھی جو تاریخ میں ثمود کے نام سے متعارف ہے۔ زمانہ ان کا قریب اڑھائی ہزار سال قبل مسیح سے ڈیڑھ ہزار سال (ق،م) کا بتایا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم کی تصریحات کے مطابق، اس قوم کو بھی بڑا تمکن حاصل تھا۔ (7:74) پُرفضا باغات، لہلہاتی کھیتیاں، صاف اور شفاف پانی کے اُبلتے ہوئے چشمے، وہ میدانوں میں بڑے بڑے محلات تعمیر کرتے تھے اور پہاڑوں میں محکم قلعے بناتے (2:74، 15:82، 26:146۔149) قرآنِ کریم نے ان کا بنیادی جرم، اور ان کے نظام کی اساسی خرابی وہ بتائی ہے جسے خود ہمارے زمانے میں بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ان کی معیشت کا انحصار گلہ بانی پر تھا۔ وہ مویشی پالتے اور ریوڑ چراتے تھے۔ ظاہر ہے کہ گلہ بانی کے لئے وسیع و عریض چراگاہوں اور پانی کے چشموں کی ضرورت لانیفک ہے اور یہ کچھ انہیں فراوانی سے حاصل تھا۔ لیکن قرآن کہتا ہے۔ کہ وہ اس کے باوجود یُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ (26:152) ملک میں فساد برپا کرتے تھے۔ اس فساد کی تفصیل غور طلب ہے۔ سردارانِ قوم ان چراگاہوں اور چشموں پر اپنی ذاتی ملکیت جتا کر انہیں اپنے مویشیوں کے لئے مخصوص کر لیتے اور کمزور اور غریب لوگوں کے جانور بھوکے پیاسے رہتے۔۔۔ ان کی طرف حضرت صالح علیہ السلام خدا کا یہ انقلابی پیغام لے کر آئے کہ یہ چراگاہیں اور چشمے، ربوبیتِ عامہ کے لئے خدا کی طرف سے مفت ملتے ہیں، اس لئے انہیں تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہئے۔

معیشت، گلہ بانی:

کسی انسان کو حق نہیں پہنچتا کہ زمین کو اپنی ذاتی ملکیت میں لے کر دوسرے انسانوں اور ان کے مویشیوں کو رزق سے محروم کر دے۔ ظاہر ہے کہ اکابرین قوم اس انقلابی دعوت کو کیسے قبول کر لیتے؟ چنانچہ، جیسا کہ ہونا چاہئے تھا اور جیسا کہ ہوتا چلا آرہا ہے، مظلوم اور نادار طبقے نے حضرت صالحؑ کی دعوت پر لبیک کہا اور سردارانِ قوم نے اس کی سخت مخالفت کی۔ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ (7:75) تکبر و نخوت کے نشہ میں مدہوش سردارانِ قوم، ان لوگوں سے پوچھتے تھے جنہیں انہوں نے بے حد کمزور اور ناتواں بنا رکھا تھا اور جو حضرت صالحؑ کے ساتھ ہو گئے تھے کہ کیا تم واقعی دل سے یقین رکھتے ہو کہ صالحؑ خدا کا پیغمبر ہے۔ وہ جواب میں کہتے کہ ہم اسی لئے اس کے ساتھ ہو گئے ہیں کہ ہم سمجھتے ہیں کہ وہ جو کچھ کہتا ہے خدا کا پیغام ہے، ورنہ یہ بھی تو ہم ہی میں

سے ایک تھا۔ یہ اس قسم کی دعوت لے کر کیوں اٹھتا۔ اِدھر سے ہٹ کر وہ خود صالحؑ سے مخاطب ہوتے اور کہتے کہ ہمیں تو کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ: اَنۡتَ مِنَ الۡمُسَحَّرِیۡنَ ﴿۱۵۳﴾ (26:153) تم پر کسی نے جادو کر دیا ہے جو اس طرح کی بہکی بہکی باتیں کرنے لگ گئے ہو۔ ورنہ کوئی صاحبِ عقل و ہوش یہ کہہ سکتا ہے کہ ان زمینوں پر ہمارے حقوق مالکانہ سب ناجائز ہیں اور ان ناداروں کو جو اپنی روٹی تک کے لئے ہمارے محتاج ہیں، ان پر اسی طرح تصرف کا حق حاصل ہے جیسا ہمیں! اس سے تو معاشرہ میں انارکی پھیل جائے گی۔ ہم اس کی کبھی اجازت نہیں دیں گے۔ وہ اُن سے کہتے کہ: قَالُوۡا یٰصٰلِحُ قَدۡ کُنۡتَ فِیۡنَا مَرۡجُوًّا قَبۡلَ ہٰذَاۤ (11:62) تو تُو ہم میں سے بڑا عقلمند آدمی تھا، قبیلہ کا ممتاز رکن تھا۔ تجھ سے ہماری بڑی بڑی اُمیدیں وابستہ تھیں۔ یہ تمہیں کیا ہو گیا کہ خود اپنے ہاتھوں سے اپنے قبیلہ کی دولت و حشمت کو برباد کر دینے کی سوچ رہے ہو! لیکن ظاہر ہے کہ خدا کے اس پیغامبر انقلاب پر ان باتوں کا کیا اثر ہو سکتا تھا۔ وہ اپنی دعوت پر جمے رہے اور دوسری طرف سے مخالفت بڑھتی چلی گئی۔ اس مقام پر قرآنِ کریم نے ایک عجیب نکتہ بیان کیا ہے۔

قوم کے سرغنہ فساد کی جڑ ہوتے ہیں:

معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت صالحؑ نے دیکھا کہ اس معاشرہ میں یہ خرابیاں عام ہو رہی ہیں، اور بات دو، چار، دس کی نہیں، یہاں تو آوے کا آوا بگڑا ہوا ہے تو سوچا کہ ان کی اصلاح کس طرح ممکن ہو گی؟ ___ سینہ تمام داغ داغ پنبہ کجا کجا نہم ___ اس پر اللہ تعالیٰ نے ان سے کہا کہ بیشک قوم میں یہ خرابیاں عام ہیں، لیکن اس سے گھبرانے کی کوئی بات نہیں وَکَانَ فِی الۡمَدِیۡنَۃِ تِسۡعَۃُ رَہۡطٍ یُّفۡسِدُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ وَلَا یُصۡلِحُوۡنَ (27:48) مملکت کے مرکزی مقام میں صرف نو سرغنے (لیڈر) ہیں جو اس سارے فساد کی جڑ ہیں۔ وہی قوم کو صحیح راستے کی طرف نہیں آنے دیتے۔ ان کا بندوبست کر لو تو سارا معاملہ درست ہو جائے گا۔

آپ نے غور فرمایا کہ قرآنِ کریم دو لفظوں میں کتنی عظم حقیقت کو بے نقاب کر گیا ہے۔ عوام نہیں بگڑتے، یہ خواص ہوتے ہیں جو اپنے مفاد کی خاطر ان میں بگاڑ پیدا کرتے اور انہیں فساد پر اُکساتے رہتے ہیں!

بہر حال، مخالفت اس حد تک بڑھ گئی کہ ان نو سرغنوں نے تہیہ کر لیا کہ حضرت صالحؑ کے مکان پر ہلہ بول کر انہیں اور ان کے اہل کو قتل کر دیا جائے اور اس کے بعد وارثوں کو قسمیں کھا کھا کر یقین دلا دیا جائے کہ ہمیں اس قتل کا کوئی علم نہیں (27:48-49) لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان کی یہ سازش بھی ناکام رہ گئی اور حضرت صالحؑ نے اتنی قوت حاصل کر لی کہ وہ لوگ مجبوراً ان کے ساتھ مصالحت پر آمادہ ہو گئے۔ اب دیکھئے کہ اس مصالحت کی شرط کیا تھی۔

آپ نے اُن سے کہا کہ تم لوگ کہتے ہو کہ یہ مویشی ہمارے ہیں اور یہ زمینیں بھی ہماری ہیں، اس لئے ہمارے مویشی ہماری زمینوں میں ہی چگیں چریں گے۔ اس کے مقابل میں وہ اُن لوگوں کے مویشی ہیں جن کی یہ زمینیں نہیں۔ اس لئے وہ

اِن زمینوں میں نہیں آسکتے۔ یہ تمہاری بھول ہے اور اس کی بنیاد اس غلط نگہی پر ہے کہ تم نے جانوروں اور زمینوں کی نسبت انسانوں کی طرف کر رکھی ہے۔ اس لئے ''میری اور تیری'' کے پھیر میں پڑ گئے ہو۔ درحقیقت پوزیشن یہ ہے کہ یہ جانور سب خدا کی مخلوق ___ تمہارے بھی اور ان دوسرے لوگوں کے بھی ___ اور زمین ساری خدا کی ہے جسے اس نے اپنی مخلوق کے لئے ذریعۂ رزق بنایا ہے۔ لہٰذا چراگاہیں سب مویشیوں کے لئے کھلی رہنی چاہئیں۔

انہوں نے کہا کہ ہمیں منظور ہے۔ آپ نے کہا کہ بہت اچھا۔ لیکن یہ ایک عملی مسئلہ ہے اس لئے اس کا ثبوت بھی عملی ہونا چاہئے۔ وہ عملی ثبوت یہ ہے کہ یہ ایک اونٹنی ہے۔ اس کے متعلق یہ سمجھو کہ یہ نہ میری ہے نہ تیری۔ نہ زید کی ہے نہ عمر کی۔ یہ اللہ کی اونٹنی ہے اور یہ زمینیں بھی اللہ کی ہیں۔ اگر تم نے اس اونٹنی کو آزاد چرنے چگنے دیا تو سمجھ لیا جائے گا کہ تم اپنے معاہدہ کے پابند ہو۔ اور اگر اس کے راستے میں رکاوٹ ڈالی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم اس سے منحرف ہو گئے ہو۔ قرآنِ کریم کے الفاظ میں ___ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ (7:73)۔ یہ ناقۃ اللہ ہے اور وہ ارض اللہ ___ ناقۃ اللہ، ارض اللہ میں چرے چگے گی۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ آپ غور کیجئے، قرآنِ کریم نے ان چار الفاظ میں، اس اقتصادی مسئلہ کا حل کس جامعیت سے پیش کر دیا ہے جو تاریخ انسانیت میں سب سے زیادہ وجۂ نزاع وفساد رہا ہے اور اب تک ہے۔ اس نے کہا یہ ہے کہ ذرائع رزق پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوسکتی۔ انہیں تمام مخلوق کے لئے کھلا رہنا چاہئے۔ حضرت صالحؑ نے، اپنے پیش نظر خاص واقعہ کی نسبت سے ناقۃ اللہ کہا ہے حضور نبی اکرم ﷺ نے اسے عالمگیر اصول قرار دینے کی جہت سے فرمایا کہ:

زمین اللہ کی ہے اور بندے بھی اللہ کے ہیں۔ اس لئے اللہ کی زمین اللہ کے بندوں کے لئے رہنی چاہئے۔ (ابوداؤد)

زمین بھی خدا کی اور بندے بھی خدا کے۔ اس لئے خدا کی زمین، خدا کے بندوں کے لئے کھلی رہنی چاہئے۔ اس پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوسکتی۔

سردارانِ قومِ ثمود نے کرنے کو تو یہ معاہدہ کر لیا لیکن وہ اسے کس طرح برداشت کر سکتے تھے کہ وہ اور قوم کا غریب طبقہ ایک سطح پر آجائیں۔ وہ جوشِ غضب میں پاگلوں کی طرح اُٹھے اور اس اونٹنی کو جو ان کے معاہدہ کی ٹھوس، نشانی تھی، ہلاک کر دیا اور اپنے اسی سابقہ نظام پر قائم ہو گئے۔ اور ظاہر ہے کہ اس قسم کے باطل نظام کا نتیجہ تباہی کے سوا اور کیا ہوسکتا تھا۔

تباہی:

قرآنِ کریم نے اس تباہی کا نقشہ دو لفظوں میں اس طرح کھینچا ہے کہ اس سے عبرت وموعظت کی ساری تصویر نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے، اس نے کہا ہے فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا ﴿۱۴﴾ (91:14) خدا نے اپنے قانونِ مکافات کی رو سے، ان کے جرائم کی بنا پر، ان پر اس طرح روڈ رولر (Road Roller) پھیر دیا کہ سب اونچ نیچ برابر

ہوگئی[1] اور اس کے بعد ہے۔ وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا ﴿15﴾ (91:15) خدا کا قانونِ مکافات جب ظالموں کو اپنی گرفت میں لیتا ہے تو اس کا ہاتھ نہیں کانپا کرتا۔ قانون کی محکمیت کا ثبوت ہی یہ ہے کہ وہ عواقب سے نہ ڈرے۔ عواقب سے ڈرنا مصلحت کوشی ہے اور مصلحت کوشی اور عدل، ایک دوسرے کی نقیض ہیں۔ اس کے بعد وہ رسول اللہ ﷺ کی قومِ مخاطب سے کہتا ہے۔ فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةً بِمَا ظَلَمُوْا ؕ (27:52) یہ ان کے گھر تمہارے سامنے موجود ہیں ویران، خالی، اُجڑے ہوئے۔ یہ اُن کے ظلم کا نتیجہ ہے۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (27:52) قومِ ثمود کی اس سرگذشت میں، اربابِ علم وبصیرت کے لئے، حقیقت تک پہنچنے کی بڑی روشن دلیل ہے اور وہ حقیقت یہ ہے کہ:

''جو قوم، خدا کے عطا کردہ ذرائع رزق کو انسانوں کی ذاتی ملکیت قرار دیدے، وہ کبھی تباہی اور بربادی سے نہیں بچ سکتی، اس قسم کے نظام کا نتیجہ ہمیشہ ہلاکت ہوگا۔''

حیاتِ آخرت سے انکار:

اس سلسلہ میں قرآنِ کریم ایک اور عظیم حقیقت کو بھی سامنے لاتا ہے وہ کہتا ہے کہ اس قسم کا غلط نظام وہی قومیں اختیار اور رائج کرتی ہیں۔ جن کا نظریۂ حیات یہ ہو کہ: اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ﴿36﴾ (23:37) زندگی اسی دنیا کی زندگی ہے موت سے انسان کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ حیاتِ آخرت اور اعمالِ انسانی کا محاسبہ سب افسانہ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب انسان کا نظریۂ زندگی یہ ہوجائے تو پھر وہ کون سی چیز ہے جو اسے سلب ونہب، لوٹ کھسوٹ اور غصب واستحصال سے روک سکے۔ نظامِ سرمایہ داری اس تصورِ حیات کا فطری نتیجہ ہے۔ یا یہ تصورِ حیات اس نظام کا لازمی نتیجہ۔

اور یہی وجہ ہے کہ روس (سوویٹ یونین) نے جب ایک طرف نظامِ سرمایہ داری کے خلاف آواز بلند کی اور دوسری طرف حیاتِ آخرت سے انکار کیا تو علامہ اقبالؒ نے اسے وارننگ دی کہ یاد رکھو۔ جس نظام کی طرف تم دعوت دیتے ہو، وہ اس تصورِ حیات کے ساتھ کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔ اس نظام کی بنیاد ہی ایمان بالآخرت ہے۔ یہ عمارت اسی بنیاد پر قائم رہ سکتی ہے۔

ایکہ می جوئی نظامِ عالمے
جُستۂ او را اساسِ محکمے

تم جو ایک عالمگیر نظام کی آرزو لے کر اُٹھے ہو، کیا تم نے اس کے لئے کسی محکم بنیاد کو بھی تلاش کرلیا ہے۔

(جاری ہے)

(1) چونکہ معاشرہ میں ناہمواریاں زمین کی بنا پر پیدا کی گئی تھیں۔ اس لئے قرآن نے تباہی کا استعارہ بھی زمین ہی کی شکل میں بیان کیا ہے۔

ادارہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآنی نظام

فروری 1965ء میں ادارہ طلوعِ اسلام کی طرف سے اس وقت کے صدر مملکت پاکستان کے نام 'قرآنی نظام' کے متعلق ایک کھلا خط لکھا گیا تھا جو طلوع اسلام کے فروری 1965ء کے شمارے میں چھپا تھا۔ 55 سالوں بعد موجودہ حکومت و سیاست کے ارباب اور عوام کی توجہ اور غور کے لئے اسے دوبارہ شائع کیا جا رہا ہے۔

بشرفِ نظر

صدر مملکت پاکستان

سلام و رحمت، ہمارا سرِ نیاز' بدرگاہِ رب العزت سجدہ ریز ہے کہ اس نے ایک بار پھر اس خطۂ زمین کو انتشار پسندی اور تخریب انگیزی سے بچا لیا اور یوں ہمیں ایک اور موقع دے دیا کہ ہم اس مقصد کے حصول کے لئے کوشاں ہوں جس کی خاطر اس مملکت کا وجود عمل میں لایا گیا تھا۔ اس سلسلہ میں ۔۔۔ یعنی اس خطۂ زمین کے تحفظ کے لئے ۔۔۔ جس قدر جدوجہد آپ نے کی ہے اس کے لئے ملک کا ہر بہی خواہ آپ کا شکر گزار ہے۔ اب جبکہ انتخاب کا ہنگامہ فرو ہو چکا ہے' ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ کچھ وقت کے لئے ہم کھڑے ہو کر اپنا جائزہ لیں اور سوچیں کہ ہمیں آئندہ کیا کرنا چاہئے ۔۔۔ ماضی میں جو کچھ ہوا' ہم اس پر کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتے۔ ہم صرف یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ مستقبل کے لئے ہمارا پروگرام کیا ہونا چاہئے۔ یہ ہے وہ مقصد جس کے لئے چند گزارشات آپ کی خدمت میں پیش کی جاتی ہیں' اس امید کے ساتھ کہ آپ انہیں اپنی توجہ کا مستحق سمجھیں گے۔

آئینِ پاکستان:

جس طرح اس خطۂ زمین کا حصول ہمارے لئے مقصود بالذات نہیں تھا بلکہ ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا' اسی طرح' منصبِ صدارت بھی مقصود بالذات نہیں بلکہ ایک عظیم مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے اور وہ مقصد اس کے سوا کیا ہے کہ اس سرزمین میں صحیح قرآنی نظام قائم کیا جائے۔ اس سلسلہ میں سب سے اہم' اولیں اور اساسی سوال آئینِ پاکستان کا ہے۔ کسی مملکت کے آئین میں بنیادی نکتہ یہ ہوتا ہے کہ مملکت کے لئے قانون سازی کا اصول کیا ہے باقی تمام تفاصیل اسی محور کے گرد گردش کرتی ہیں۔ اگر ہماری مملکت سیکولر ہوتی تو اس مسئلہ کا حل کچھ بھی مشکل نہیں تھا۔ مغرب کے جمہوری انداز کے مطابق'

مجلس قانون ساز (پارلیمان) کی اکثریت جو فیصلے کرتی وہی مملکت کے قوانین بن جاتے لیکن جس مملکت کا وجود ایک آئیڈیالوجی کی رو سے عمل میں آیا ہو۔۔۔اور اس آئیڈیالوجی کی حیثیت اس کے دین اور ایمان کی ہو۔۔۔اس میں قانون سازی کا یہ اصول، کسی صورت میں کارفرما نہیں ہوسکتا۔اس میں مجالس قوانین ساز کے اختیارات غیر محدود نہیں ہوتے بلکہ اس کی آئیڈیالوجی کے حدود کے اندر مقید ہوتے ہیں۔لہٰذا اس مملکت کے آئین کی پہلی خصوصیت یہ ہونی چاہئے کہ وہ ان حدود کا تعین کرے جس کے اندر رہتے ہوئے مملکت کا قانون وضع کیا جاسکتا ہے۔

قانون سازی کا اصول:

اسلامی مملکت کے لئے قانون سازی کے اس اصول کو آپ خود اپنے بیانات اور تقاریر میں اس طرح واشگاف کر چکے ہیں کہ اس کے بعد اس سلسلہ میں کسی مزید تشریح کی ضرورت نہیں رہتی۔۔۔(مثلاً) آپ نے، پاک جمہوریہ کے دورہ کے سلسلہ میں، 18 دسمبر 1959ء کو ایک مقام پر فرمایا تھا:

جہاں تک اسلامی اصولوں کا تعلق ہے پاکستان کا دستور یقیناً ان کا آئینہ دار ہوگا لیکن اسے سمجھ لینا چاہئے کہ اسلام کے اصول غیر متبدل رہتے ہیں لیکن ان کی جزئیات، تفصیلات اور طریقے حالات کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ان جزئیات کو ہمارے موجودہ حالات کے مطابق مرتب ہونا چاہئے۔اس کے بعد آپ نے، 14 جولائی 1960ء کو، ادارۂ تحقیقاتِ اسلامیہ کے گورنروں کے اجلاس کا افتتاح کرتے ہوئے فرمایا تھا:

اس امر کی وضاحت نہایت ضروری ہے کہ اسلام کے بنیادی اصول کون سے ہیں اور جن طریقوں سے انہیں عمل میں لایا گیا تھا وہ کیا ہیں۔اس لئے ضروری ہے کہ اس باب میں کوئی الجھن باقی نہ رہے کہ اسلام میں کونسی باتیں غیر متبدل ہیں اور کونسی ایسی جن میں تغیر و تبدل کیا جاسکتا ہے۔

اور اس امر کی وضاحت بھی آپ نے خود ہی کر دی تھی جب آپ نے 1961ء میں، عیدالاضحیٰ کی تقریب پر ملک کے نام اپنے نشریہ میں فرمایا تھا کہ:

جہاں تک اسلام کے اصولوں کا تعلق ہے اسے خود اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں وضاحت سے بیان فرما دیا ہے۔

ان تصریحات کی روشنی میں، پاکستان میں قانون سازی کے اصول کا مسئلہ بالکل واضح ہو جاتا ہے۔یعنی:

جو احکام، قوانین، اصول اور حدود قرآن کریم میں بیان ہوئے ہیں وہ غیر متبدل ہیں۔ان قوانین کی مزید جزئیات اور ان اصولوں کی تفصیلات، قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے ہم خود مرتب کر سکتے ہیں۔ان جزئیات اور تفاصیل میں، زمانے کی ضرورتوں کے اعتبار سے، تبدیلی ہوسکتی ہے لیکن جو کچھ غیر متبدل ہے اس میں تبدیلی کرنے کا اختیار کسی کو حاصل نہیں۔

یہ ہے قانون سازی کا وہ اصول جسے ہمارے آئین کے اندر داخل ہونا چاہئے۔جب تک ایسا نہیں ہوگا ہماری مملکت

کے لئے کوئی ضابطۂ قوانین ایسا مرتب نہیں ہو سکے گا جسے اسلامی کہا جا سکے۔ اس امر کی شہادت خود یہ تلخ حقیقت ہے کہ مملکت کو وجود میں آئے قریب اٹھارہ سال ہو گئے لیکن ابھی تک اس کا کوئی ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہوا۔ اس ضمن میں جس قدر کوششیں ہوئیں وہ سب بے نتیجہ رہیں، اس لئے کہ ہمارے آئین میں قانون سازی کی یہ اصل ہی گم تھی۔ جب تک یہ اصل، آئین کے اندر داخل نہیں کی جائے گی، وہ مقصد کبھی حاصل نہیں ہو سکے گا جس کے لئے اس مملکت کو متشکل کیا گیا تھا۔

علم و بصیرت اور غور و تدبر:

آئین میں اس تبدیلی کے بعد، سب سے بڑی ضرورت اس امر کی ہے کہ مملکت کے مسائل، علم و بصیرت اور فکر و تدبر کی رو سے حل کئے جائیں۔ یہ وہ ضرورت ہے جس کا احساس آپ نے بہت پہلے کر لیا تھا۔ چنانچہ 6 جولائی 1959ء کو آپ نے، مری میں، کمشنرز کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ:

اس وقت اشد ضرورت اس امر کی ہے کہ اہل فکر و نظر حضرات کو دعوتِ غور و تدبر دی جائے کہ وہ زندگی کے ان مسائل کا نہایت معقول حل دریافت کریں۔

اس سلسلہ میں، ہمارے راستے میں جو چیز سنگ گراں بن کر حائل ہو رہی ہے، اس کی تشریح بھی آپ متعدد مواقع پر نہایت وضاحت سے کر چکے ہیں۔ چنانچہ آپ نے، مئی 1959ء کو، دارالعلوم ٹنڈو الہ یار میں، ''علماء'' سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

جب زندگی اور مذہب کا رشتہ منقطع ہو جائے تو زندگی تو بہر حال کسی نہ کسی سمت چلتی رہتی ہے لیکن مذہب ایک ایسی بے جان شے بن کر رہ جاتا ہے جس میں نہ لوچ اور لچک باقی رہتی ہے نہ حرکت اور نمود کی صلاحیت۔ یہ جامد اور متحجر مذہب (زندگی کے دوش بدوش چلنے کے بجائے) مسجدوں، خانقاہوں میں مقید ہو کر رہ جاتا ہے۔ اسلام کے ساتھ یہی ہوا۔ انسانیت، سائنس اور فلسفہ میں ترقی کرتے کرتے کہیں کی کہیں پہنچ چکی ہے لیکن ہمارا مذہب صدیوں سے ایک ہی مقام پر ساکت و صامت کھڑا ہے۔ اسلام کا معجزہ یہ تھا کہ اس نے بت پرستی کا خاتمہ کر دیا لیکن مسلمانوں کا المیہ یہ ہے کہ انہوں نے اسلام کو بت بنا دیا۔

اس تبدیلی کا خطرناک انجام واضح کرتے ہوئے آپ نے کہا تھا:

مذہب کو یوں بت بنا دینے کا ایک خطرناک نتیجہ، جس نے ہماری ملی ذہنیت اور ثقافت پر تباہ کن اثر ڈالا ہے، یہ تھا کہ جن لوگوں نے عصر حاضر کی ترقیوں کا ساتھ دیتے ہوئے آگے قدم اٹھایا ان پر ''دنیا دار'' ہونے کی مہر ثبت کر دی گئی اور جو لوگ مذہبی رسومات و روایات کی آڑ لے کر ماضی کی دنیا میں، جمود و سکوت کے مجسمے بن کر رہ گئے، وہ سچے اور پکے مسلمان کہلانے لگے۔ رفتہ رفتہ ہوا یہ کہ مستقبل کی طرف نگاہ رکھ کر، شاہراہِ حیات پر آگے بڑھنے والے، اسلام سے منحرف اور برگشتہ شمار ہونے لگے اور ماضی کی طرف دیکھنے والے مقدس و دیندار قرار پا گئے۔ ہر نئے اقدام، ہر نئی ایجاد، ہر نئی تعلیم کے متعلق یہ شور برپا کر دیا

گیا کہ یہ اسلام کے خلاف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری تاریخ کے ہر دور میں ہر انقلابی راہنما کے خلاف کفر کے فتوے لگتے رہے۔

حریتِ فکر ونظر کی یہ تھی وہ اہمیت جس کی شدت کا احساس کرتے ہوئے آپ نے مئی 1964ء میں' کراچی میں' ارباب دانش وبینش کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

اگر ہم ترقی کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں پامال راہوں کو چھوڑ کر نئی راہیں اختیار کرنی ہوں گی۔ اگر ہم ایسا نہیں کریں گے تو ہم کبھی اس رفتار سے آگے نہیں بڑھ سکیں گے جس سے ہمیں بڑھنا چاہئے۔ میں' درحقیقت' فکر کی دنیا میں' زیادہ سے زیادہ ''ملحد'' دیکھنا چاہتا ہوں۔

لیکن اس وقت حالت یہ ہے کہ آزادیٔ فکر ونظر پر پہلے سے بھی زیادہ سنگین پہرے لگے ہوئے ہیں جن کی وجہ سے اچھے اچھے لوگوں کو اس کی جرأت نہیں ہوتی کہ جو کچھ وہ کمروں کے اندر کہتے ہیں اسے دروازے سے باہر نکل کر دہرا سکیں۔ اس قدغن کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگوں کے سینوں میں دل سہمے ہوئے ہیں اور وہ منافقت کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔ جو ذرا سی جرأت کرتا ہے وہ اپنے آپ کو اس پرہجوم معاشرہ میں تنہا پاتا ہے جس کی وجہ سے قدامت پرستی کی قوتیں اس پر چاروں طرف سے جھپٹ پڑتی ہیں۔ ماحصل اس کا یہ ہے کہ ہم فکر کی دنیا میں' اپنے دورِ غلامی کے مقام سے بھی پیچھے ہٹ چکے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہماری فکر (مغرب کی طرح) بدلگام نہیں ہوسکتی۔ اسے قرآن کی متعین کردہ حدود کے اندر ہی آزادی مل سکتی ہے۔۔۔ وہ میدان بڑا وسیع ہے۔۔۔ لیکن یہاں تو حالت یہ ہے کہ قوم کا طبقۂ جہلاء' فکر کی راہوں پر رہزن بن کر بیٹھا ہے اور اس کا اعلان یہ ہے کہ جو کچھ وہ کہتا ہے جس نے اس سے ذرا سا بھی اختلاف کیا' اس پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا جائے گا۔

جب تک ملک میں ایسے حالات پیدا نہ کئے جائیں جن سے صحیح فکر کی راہیں کشادہ ہوں' ہماری ہزار مادی ترقی بھی ہمیں انسانوں کی صف میں کھڑے ہونے کے قابل نہیں بنا سکے گی۔ اس سلسلہ میں کرنے کا کام یہ ہے کہ

1- مذہب کے نام پر جو دہشت فضا میں پھیلا دی گئی ہے اور پھیلائی جا رہی ہے' اسے ختم کیا جائے۔ اور

2- آنے والی نسلوں کی تعلیم کا صحیح انتظام کیا جائے۔

تعلیم کا مسئلہ

قوموں کے مستقبل کا مدار کس طرح صحیح تعلیم پر ہے' اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ آپ کو خود اس کا پورا پورا احساس ہے۔ آپ نے اپنے مشرق وسطیٰ کے دورہ پر' قاہرہ اور جدہ میں تقاریر کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

ہمارے نظام تعلیم کا اولیں مقصد یہ ہونا چاہئے کہ ہم اسلام کو توہم پرستی اور تقلید وجمود کے اس جالے سے نکالیں جو اس پر چاروں طرف سے تنا گیا ہے اور عصر حاضر کے علم اور سائنٹفک تحقیقات کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر' اسے آگے بڑھاتے

جائیں..... اس ضمن میں سب سے پہلے کرنے کا کام یہ ہے کہ ہم اپنے ذہن کو ماضی کے جمود و تعطل سے آزاد کریں۔ دین کے ہر معاملہ میں دیانتدارانہ اور آزادانہ طور پر تحقیق کریں۔ اسلام پر اس انداز سے عمل کریں کہ وہ اس ایٹمی دور میں، زمانے کی برق رفتاری کا ساتھ دے سکے۔ یہ ہے وہ مقصد جس کے لئے ہم اپنے نظام تعلیم میں ایسی انقلابی تبدیلی پیدا کرنا چاہتے ہیں جس سے ہماری آنے والی نسلیں دینی اور دنیاوی تعلیم کے امتزاج سے نہایت اچھے انسان اور نہایت اچھے مسلمان بن سکیں۔

یہ تھا ہمارے کرنے کا کام۔ لیکن اس ضمن میں بھی ہمیں پھر اس تلخ حقیقت کو دہرانا پڑتا ہے کہ ہم اسی مقام پر کھڑے ہیں جہاں ہم انگریز کے زمانے میں تھے۔ بلکہ اس سے بھی چار قدم پیچھے۔ اس زمانے میں ہمارے دینی مدرسے الگ ہوتے تھے اور دنیاوی مدرسے الگ۔ دنیاوی مدرسوں میں، گورنمنٹ اسکول اور کالج الگ ہوتے تھے اور اسلامیہ اسکول اور کالج الگ۔ ان دونوں میں فرق صرف اتنا ہوتا تھا کہ اسلامیہ اسکولوں میں ایک پیریڈ دینیات کا ہوتا تھا۔ جس میں ''مسئلے مسائل'' پڑھائے جاتے تھے۔ آپ غور کیجئے کہ کیا ہمارا نظام تعلیم اس وقت بھی اسی راستے پر نہیں چلا جا رہا؟ باقی رہا یہ کہ ہم اس مقام سے بھی چار قدم پیچھے ہیں، سو وہ اس طرح کہ پہلے ہماری ''دینی تعلیم'' پرائیویٹ انتظامات کی رہینِ کرم ہوتی تھی۔ اب اسے خود حکومت کی سرپرستی حاصل ہے۔۔۔ حتیٰ کہ اوقاف کا اس قدر روپیہ (جو پہلے صرف ضائع جاتا تھا اب) اسی توہم پرستی اور قدامت پسندی کی ترویج اور فروغ کے لئے صرف کیا جاتا ہے جسے آپ نے قوم کی تباہی کا موجب بتایا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ حدود پاکستان کے اندر تقسیم ہند کے وقت جس قدر مذہبی درسگاہیں تھیں آج ان کی تعداد اس سے کئی گنا زیادہ ہے۔

جب حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں دین اور دنیا میں ثنویت نہیں تو پھر ہمارے نظام تعلیم میں دینی مکاتب اور دنیاوی درسگاہوں کی تفریق اور دنیاوی درسگاہوں میں مذہب کی تعلیم کے لئے ایک الگ پیریڈ کی تخصیص، چہ معنی دارد؟ ہمارے نظام تعلیم کی بنیاد اس اصول پر ہونی چاہئے کہ ہم طالب علموں کو سائنس پڑھائیں یا فلسفہ تاریخ کی تعلیم دیں یا سیاسیات کی۔ معاشی علوم کا نصاب زیر تدریس ہو یا معاشرتی کا۔ طلباء کو بتایا یہ جائے کہ ان علوم کو قرآن کی رو سے عطا کردہ مستقل اقدار کے تابع کس طرح رکھا جا سکتا ہے اور ان کی رو سے حاصل کردہ قوتوں کو وحی کی منشاء کے مطابق، نوع انسان کی بہبود کے لئے صرف کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح اسلام کی روح، اس پوری تعلیم کے رگ و پے میں اس طرح حلول کر جائے گی جس طرح ہماری فکر و دانش، پیچیدہ معاملات کے حل کرنے کی کوششوں میں غیر محسوس طور پر کارفرما ہوتی ہے۔ باقی رہی فقہ (یعنی اسلامی قانون) کی تعلیم۔۔۔ جسے آج کل ''مسئلے مسائل'' کہا جاتا ہے سو اس کا مقام ''لاء کالجز'' ہیں۔

لہٰذا، نظام تعلیم میں اس انقلابی تبدیلی کے لانے کے لئے جس کی طرف آپ نے اپنی محولہ بالا تقریر میں اشارہ کیا تھا، اولیں قدم یہ ہے کہ جداگانہ مذہبی تعلیم کی درسگاہوں کو بند کیا جائے اور دین کی تعلیم کو، دنیاوی تعلیم کے عروق میں خونِ زندگی بنا

کر دوڑا دیا جائے۔

اس میں شبہ نہیں کہ اس قسم کی انقلابی تبدیلی کے لئے جرأتِ رندانہ کی ضرورت ہوگی لیکن جب آپ کو یقین ہے کہ قوم کے مرضِ کہن کا چارہ اس کے سوا کوئی اور نہیں تو پھر اس.....تبدیلی کے راستے میں کسی بات کو حائل نہیں ہونا چاہئے۔ قابل سرجن کا ہاتھ نشتر اٹھاتے وقت کبھی کانپا نہیں کرتا۔

روٹی کا مسئلہ:

لیکن یہ ساری تبدیلیاں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے اسی صورت میں ثمر بار ہو سکتی ہیں جب قوم کے افراد زندہ رہیں اور یہ ظاہر ہے کہ انسانی زندگی کا مدار روٹی پر ہے۔ اس حقیقتِ کبریٰ کا اعلان خود آپ نے 1959ء میں مری (کی کمشنرز کانفرنس) میں ان الفاظ میں کیا تھا کہ:

انسانی دل و دماغ کسی آئیڈیالوجی پر، خواہ وہ کتنی ہی بلند کیوں نہ ہو، کبھی لبیک نہیں کہتا جب تک اسے دو وقت پیٹ بھرنے کا یقین نہ ہو جائے اس لئے اس امر کی بھی اشد ضرورت ہے کہ روٹی کے مسئلہ پر خاص توجہ دی جائے۔

''روٹی کے مسئلہ'' کے حل کے سلسلہ میں، مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام اور کمیونزم کے معاشی مسلک میں جو کشمکش جاری ہے، اس پر تبصرہ کرتے ہوئے آپ نے ٹنڈو الہ یار کے اپنے خطاب میں فرمایا تھا:

آج دنیا دو کیمپوں میں بٹی ہوئی ہے اور ان کی باہمی کشمکش آئیڈیالوجی پر مبنی ہے۔ کمیونزم تہیہ کر چکی ہے کہ وہ اپنی آئیڈیالوجی تمام دنیا پر مسلط کر دے۔ مغرب، کمیونزم کا کوئی مؤثر اور مکمل جواب نہیں پیش کر سکا۔ اس لئے کہ اس کی آئیڈیالوجی بنیادی طور پر مادہ پرستی پر مبنی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جو اقدار مادیت سے نمودار ہوتی ہیں نظام کائنات میں ان کا بھی ایک مقام ہے، لیکن وہ ایسی اہم نہیں کہ نوع انسانی ان کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دے۔ اندریں حالات کمیونزم کا ایک اور صرف ایک جواب ہے اور وہ جواب اسلام سے مل سکتا ہے۔ کمیونزم کے فلسفہ اور مغرب کی مادی اقدار کی کشمکش میں صرف اسلام ہی وہ فطری آئیڈیالوجی بن سکتا ہے جو روحِ انسانیت کو ہلاکت سے بچا سکتی ہے۔

لاریب۔ کمیونزم کے باطل فلسفہ اور مغرب کے انسانیت سوز سرمایہ دارانہ نظام کی کشمکش میں، اسلام ہی وہ آئیڈیالوجی پیش کرتا ہے جس پر قائم کردہ معاشی نظام انسانیت کو ہلاکت سے بچا سکتا ہے لیکن ہم ہیں کہ ایک طرف تو یہ اعلان کرتے ہیں کہ مغرب، کمیونزم کا کوئی مؤثر جواب نہیں پیش کر سکا، اور دوسری طرف، خود اپنے ہاں مغرب کا معاشی نظام رائج کئے ہوئے ہیں اور اسی نظام سے کمیونزم کا مقابلہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مغرب کی آئیڈیالوجی جس مادہ پرستی کی مظہر ہے اس کی بنیاد اس عقیدہ پر قائم ہوتی ہے کہ:

انسان کے لئے کام کرنے کا جذبۂ محرکہ صرف مفاد خویش کی کشش ہے۔

اس عقیدہ کا فطری نتیجہ سرمایہ دارانہ نظام ہے جو اپنی ہستی کے جواز میں دلیل ہی یہ پیش کرتا ہے کہ اگر افراد کو ان کی کوششوں کے ماحصل کا مالک قرار نہ دیا جائے تو وہ کبھی جی بھر کر محنت نہیں کریں گے اور بدقسمتی یہ کہ خود ہمارے ہاں کا مذہبی طبقہ اس فلسفہ اور نظام کو عین اسلامی قرار دیتا ہے۔ مقام حیرت ہے کہ ایک طرف ہماری حالت یہ ہے کہ جب ہم تاریخ انسانیت کی بلند ہستیوں کا ذکر کرتے ہیں تو ان کی بنیادی خصوصیت یہ بتاتے ہیں کہ انہوں نے مفادِ خویش سے بلند ہو کر مفادِ انسانیت کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی تھی اور اس کے لئے وہ دن رات محنت کرتے اور مشقتیں اٹھاتے تھے اور دوسری طرف ہم اس عقیدہ کو ''فطرتِ انسانی'' کا تقاضا (اور اسلام کے عین مطابق) قرار دیتے ہیں کہ انسان کے لئے کام کرنے کا جذبۂ محرکہ صرف مفادِ خویش کی کشش ہے۔ کہا جائے گا کہ جن بلند ہستیوں کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے ان کا شمار مستثنیات میں ہوتا ہے۔ عام انسانوں کی ''فطرت'' ایسی نہیں ہوتی لیکن یہ دلیل بالبداہت باطل ہے۔ قرآن ایک ایسا فلسفۂ زندگی اور نظام حیات پیش کرتا ہے جس پر کاربند ہونے سے عام انسان' ان خصوصیات کے مالک بن جاتے ہیں جنہیں ہم مستثنیات کی صفات قرار دیتے ہیں۔ غلط نظام میں اس قسم کی خصوصیات کے حامل افراد کا شمار واقعی مستثنیات میں ہوتا ہے۔ لیکن قرآنی نظام میں یہی استثناء عمومیت بن جاتا ہے۔

لہٰذا' مغرب کی مادہ پرستی اور کمیونزم کی انسانیت سوزی کا ایک ہی علاج اور جواب ہے اور وہ یہ کہ ہم اپنے ہاں قرآن کا معاشی نظام عملاً رائج کر دیں۔

آپ نے خود بھی یہی علاج بتایا تھا جب (ٹنڈو الہ یار کے خطبہ میں) فرمایا تھا کہ:

کمیونزم کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اسلام کو ماضی کے خلوت کدوں سے نکال کر عصر حاضر کی روشنی اور زبان میں پیش کیا جائے۔ اسے صرف ایک نظری آئیڈیالوجی کی حیثیت سے پیش نہ کیا جائے بلکہ ایک تمدنی' سیاسی' معاشی اور روحانی زندگی کے لئے مکمل ضابطۂ حیات کی حیثیت سے پیش کیا جائے۔ یہی اسلام کی صحیح اور بنیادی پوزیشن ہے۔

یہی وہ نظام ہے جو ایک طرف' انسان کو مفادِ خویش کی تنگنائے سے نکال کر' مفادِ انسانیت کی وسیع فضاؤں میں اڑنے کی قوت عطا کر دیتا ہے اور دوسری طرف مملکت کو اس قابل بنا دیتا ہے کہ وہ اپنی اس بنیادی ذمہ داری سے بطریق احسن سبکدوش ہو سکے جس کی رو سے اس مملکت کی حدود میں بسنے والا کوئی متنفس اپنی بنیادی ضروریات زندگی سے محروم نہیں رہتا۔

واضح رہے کہ قرآنی نظام میں یہ مملکت کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ ہر متنفس کو بنیادی ضروریات زندگی بہم پہنچائے اور ہر فرد انہیں بطور اپنے حق کے مملکت سے طلب کر سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مملکت اپنی اس عظیم ذمہ داری سے اسی صورت میں عہدہ برا ہو سکتی ہے جب رزق کے سرچشمے اور وسائل پیداوار افراد کی ملکیت میں رہنے کے بجائے ملت کے اجتماعی کنٹرول میں رہیں۔ اس نظام کی مخالفت' مذہبی پیشوائیت اور سرمایہ دار طبقہ دونوں کی طرف سے ہوگی۔ اول الذکر اسے کمیونزم قرار دے کر

الحاد اور بے دینی بتائے گا اور ثانی الذکر اسے بنیادی حقوق میں دست اندازی سے تعبیر کرے گا۔ لیکن یہ نہ تو کمیونزم ہے اور نہ ہی انسانیت کے بنیادی حقوق میں دست اندازی۔ یہ اس قرآن کریم کا نظام ہے جو انسانیت کے بنیادی حقوق کا سب سے بڑا محافظ ہے۔ اس سے انسانیت کے غصب شدہ حقوق کی بازیابی ہوتی ہے نہ کہ ان کا سلب ونہب۔ (یہ نظام کس طرح کمیونزم کے باطل نظام کی ضد اور اسلام کا تقاضا ہے' اس کی وضاحت ہم متعدد مقامات پر کر چکے ہیں)۔ باقی رہا مخالفت کا سوال' سو وہ کونسی بنیادی تبدیلی ہے جو مخالفت کے بغیر عمل میں آ سکتی ہے؟ اسی لئے تو اقبالؒ نے کہا تھا کہ:

کچھ ہاتھ نہیں آتا بے جرأت رندانہ

آپ نے اپنے انتخابی منشور میں کہا تھا کہ آپ کے پیش نظر حسب ذیل مقاصد ہیں۔

(1) طبقاتی تقسیم کا مٹانا۔

(2) دولت کی عادلانہ تقسیم۔

(3) غریب اور امیر کی تفریق ختم کرنا۔

(4) اشیائے ضروریہ کی اتنی قیمتیں مقرر کرنا کہ وہ ہر ایک کی دسترس کے اندر ہوں۔

(5) ہر ایک خاندان کے لئے سکونتی مکان مہیا کرنا۔

(6) ملک سے رشوت ستانی اور بدعنوانی کا ختم کرنا۔

یہ تمام مقاصد' قرآن کے معاشی نظام کی رو سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ اس کے سوا ان کے حصول کی کوئی اور شکل نہیں۔

صدر محترم! یہ ہیں وہ چند گزارشات جنہیں ہم سردست آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔ یہ صرف ہماری استدعا ہی نہیں۔ ملک کے کروڑوں دھڑکتے ہوئے دلوں کی آواز ہے جسے ہم آپ کے گوش گزار کرنا اپنا انسانی اور ملی فریضہ سمجھتے ہیں۔

راعیٔ ملت! صدر مملکت کا منصب' بزرگ خاندان کا سا ہوتا ہے جسے اپنی مملکت (یعنی گھر کے اندر) اختیارات اس لئے حاصل ہوتے ہیں کہ وہ ہر فردِ خاندان کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرے۔ ہر متنازعہ فیہ معاملہ کا فیصلہ عدل وانصاف کے مطابق کرے۔ ہر ایک کی کمی کو پورا کرے۔ گھر کا نظم ونسق درست رکھے اور بچوں کی تعلیم وتربیت اس انداز سے کرے کہ وہ دنیا میں شریف زادے کہلائیں اور انسانوں کی صف میں ممتاز حیثیت حاصل کریں۔ جو باپ ان ذمہ داریوں کو پورا کرتا ہے' بچے اس کا دل سے احترام کرتے ہیں اور باہر والوں کی نگاہوں میں بھی اسے عزت حاصل ہوتی ہے۔ جن لوگوں کے ہاتھ میں قوموں کی زمام اقتدار آتی ہے' اللہ تعالیٰ ان کے متعلق کہتا ہے کہ:

ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴﴾ (10:14)

پھر' ہم نے' تمہارے پیش رووں کے بعد' ملک کی حکومت تمہیں دی تا کہ ہم دیکھیں کہ تم کس قسم کے کام کرتے ہو۔

آپ نے اس سے دیکھ لیا ہوگا کہ آپ کو حالیہ انتخاب میں جو کامیابی ہوئی ہے اس سے آپ پر کس قدر عظیم ذمہ داری عائد ہوگئی ہے۔۔۔ایسی عظیم ذمہ داری جس کے احساس سے حضرت عمرؓ جیسے خلیفہ راشد نے' اپنی زندگی کے آخری لمحات میں' با چشم نم کہا تھا کہ اے کاش! میں امیر المؤمنین ہونے کے بجائے' گھاس کا تنکا ہوتا تا کہ ان ذمہ داریوں کی باز پرس سے بچ جاتا۔

یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

کسی فرد کو کام کرنے کا موقع مل جانا' اس کی بڑی خوش بختی ہوتی ہے۔ ورنہ اکثر لوگوں کی کیفیت وہ ہوتی ہے جسے قرآن کریم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:

حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ﴿۹۹﴾ لَعَلِّيْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ كَلَّا ۭ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَاۗىِٕلُهَا ۭ وَمِنْ وَّرَاۗىِٕهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ (23:99-100)

یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کی موت آجاتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ اے پروردگار! تو مجھے ایک بار پھر وہیں بھیج دے جہاں سے میں آرہا ہوں تا کہ میں اچھے کام کرسکوں۔۔۔جواب ملے گا کہ اب ایسا نہیں ہوسکتا۔ (وقت کا دھارا پیچھے کی طرف نہیں مڑا کرتا)۔

آپ اس موقعہ کو غنیمت جانئے اور اس مقصد کو پورا کر جایئے جس کے لئے اس مملکت کو حاصل کیا گیا تھا اور جسے ہم آج تک صرف دہراتے چلے آرہے ہیں۔۔۔یعنی مملکت میں قرآنی نظام کا قیام۔۔۔(جیسا کہ ہم نے عسکری انقلاب کے بعد لکھا تھا) اگر یہ مقصد آپ کے ہاتھوں پورا ہوگیا تو یقین مانئے' آپ کا نام جریدۂ عالم پر سورج کی کرنوں سے لکھا جائے گا۔ تاریخِ انسانیت' آپ کو اقوام عالم میں بلند ترین مقام عطا کرے گی۔ اور جب آپ بحضورِ داور داد وار جائیں گے تو خود اسلام آگے بڑھ کر آپ پر' یہ کہتے ہوئے تبریک وتہنیت کے پھول برسائے گا کہ:

یہ ہے وہ مردِ بلند ہمت جس کی قوت بازو سے زمانے میں میرا سکہ رواں ہوا۔

کس قدر خوش نصیب ہے وہ انسان جس کا انجام ایسا ہو۔ خدا کرے کہ یہ خوش نصیبی آپ کے حصہ میں آئے اور آپ' دنیا سے جاتے وقت' آسمان سے بصد فخر ومباہات کہہ سکیں کہ ؎

دیدۂ آغازم ۔۔۔۔ انجامم نگر

والسلام بصد احترام

خیر اندیش

ادارہ طلوع اسلام' لاہور

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی
www.azharabbas.com
khawaja.azharabbas@gmail.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نفسِ انسانی صرف اسلامی نظام میں نشوونما پاتا ہے اس لئے اس کا قیام ضروری ہوتا ہے

انسانوں کے معاشرے کی ابتداء قبائلی نظام سے ہوئی۔ اس میں چونکہ اختیارات ایک ہی شخص کے پاس ہوتے تھے۔ اس سے ملوکیت کی ابتداء ہوگئی جو کہ دوسری املاک کی طرح توارث میں منتقل ہوتی تھی لیکن انسان اس نظام سے مطمئن نہیں تھے، تو آمریت نمودار ہوئی۔ فی زمانہ جمہوریت کا دور دورہ ہے، اختیارات کو آپس میں بانٹ لیا جاتا ہے لیکن جمہوریت بھی انسانیت کے تقاضے پورے کرنے سے قاصر رہی۔ ان تمام نظاموں میں فرق صرف ظواہر اور طریقوں کا تھا روح ہر جگہ وہی کار انداز ہے یعنی ایک انسان کا دوسرے انسانوں پر یا انسانوں کے ایک گروہ کا دوسرے گروہ پر حکومت کرنا۔ ان تمام نظاموں کی یہی بنیادی غلطی ہے کیونکہ یہ انسان کے مجد و شرف کے خلاف ہے۔ انسان تو ہر حال میں با اختیار ہے اور اپنے اعمال کی جوابدہ نوع ہے۔ حیوانات کی یہ کیفیت ہے کہ کوئی حیوان اپنے ہم جنس حیوان کی فرمانبرداری اور اطاعت نہیں کرتا۔ اس بارے میں علامہ اقبال کی ایک بہت عمدہ رباعی ہے جو حجت کا درجہ رکھتی ہے فرمایا:

آدم از بے بصری بندگیٔ آدم کرد گوہرے داشت ولے نذرِ قباد و جَم کرد
یعنی از خوئے غلامی ز سگاں خوارتر است من ندیدم کہ سگے پیشِ سگے سر خم کرد

قرآن کریم نے جسم اور نفس (ذات) دونوں کے مجموعے کو انسان قرار دیا ہے۔ قرآن کریم کے مطابق انسان صرف جسم کا نام نہیں ہے بلکہ اس جسم کے ساتھ ساتھ ایک اور شے بھی جسے اس کی ذات، یا نفس کہتے ہیں۔ جب میں میرا ہاتھ، میرا پاؤں، میری پشت، کہتا ہوں، یہ تو یہ چیز جو میرے جسم سے الگ ہے اور جس کی طرف میں ان چیزوں کو اضافت دے رہا ہوں، وہ میری ذات یا میری نفس ہے۔ جب میں خوش ہوتا ہوں تو یہ خوشی میرے ہاتھوں یا پاؤں کو نہیں ہوتی یہ خوشی وہ ذات محسوس کرتی ہے جو میرے جسم کے ساتھ ساتھ ہے۔ زندگی جب حیوانیت کی سطح سے بلند ہوئی ہے تو انسان کو یہ ذات عطا ہوئی

جس کے عطا ہونے کے بعد زندگی انسانیت کے معیار پر آتی ہے۔ جمہوری/سیکولر حکومتیں انسانی ذات کی قائل نہیں ہوتیں اس لئے نہ تو وہ مستقل اقدار کو مانتی ہیں اور نہ ہی ان کے سامنے کوئی مطمحِ نگاہ ہوتا ہے۔ اس لئے انہیں مستقل اقدار کی بھی حرمت نہیں ہوتی، یہ سیکولر کر حکومتیں خیر و شر یا Good and Evil کو بھی Define نہیں کر سکتیں۔ ان کے نزدیک جو کام ان کے یا ان کی حکومت کے لئے فائدہ مند ہے وہ Good ہے اور جو کام ان کے یا ان کی حکومت کے لئے نقصان دہ ہے، وہ Evil ہے۔ ان کے ہاں خیر و شر کا کوئی مستقل Object یا معیار نہیں ہوتا۔ سب کام Expediency پر چلتا ہے۔

اسلامی مملکت کی اساس انسانی ذات پر ہوتی ہے۔ اس ذات کو نشوونما دینا ہر فرد کا اولین فریضہ ہے۔ اس ذات کی نشوونما صرف اس معاشرے میں ہوتی ہے جو مستقل اقدار پر قائم ہوتا ہے۔ دوسروں پر خرچ کرنے سے ذات کی نشوونما ہوتی ہے الَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَكّٰیۚ﴿۱۸﴾ (92:18) جو اپنا مال دوسروں پر صرف کرتا ہے اس کی ذات کی نشوونما ہو جاتی ہے قرآنِ کریم کے مطابق دوسروں کی پرورش سے اپنی پرورش ہوتی ہے وَمَنْ تَزَكّٰی فَاِنَّمَا یَتَزَكّٰی لِنَفْسِهٖؕ (35:18)، جو دوسروں کی پرورش کرتا۔ اس سے اس کی اپنی پرورش ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ضابطۂ حیات جو قرآنِ کریم میں محفوظ ہے۔ اس کی اساس ہی مستقل اقدار پر ہوتی ہے۔ جس وقت اور جس مقام پر بھی یہ ضابطۂ حیات جاری کر دیا جائے، جس جگہ بھی اس ضابطۂ حیات کی اطاعت ہوگی۔ وہاں خود بخود نفس انسانی نشوونما حاصل کرتی چلی جائے گی۔ غیر اسلامی مملکت میں زندگی گزارنے سے نفس انسانی کی پرورش نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اس کے اکثر و بیشتر قوانین مستقل اقدار کے خلاف ہوتے ہیں۔ مستقل اقدار کی پابندی سے زندگی نشوونما حاصل کرتی ہے اور اس میں استحکام پیدا ہوتا ہے۔ اگر موت کے وقت یہ اتنی مضبوط ہو جاتی ہے کہ موت کے دھکے کے بعد بھی اس کا استحکام بڑھتا چلا جاتا ہے۔ تو یہ ذات ارتقاء حاصل کر کے اگلی نوعِ میں منتقل ہو جاتی ہے اور یہی اس کا جنت میں داخل ہونا ہے۔ لیکن اگر خدا نخواستہ یہ ذات موت کے بعد مزید ترقی نہیں کرتی اور اگلی نوع میں منتقل نہیں ہوتی تو یہ جمود اس کی جہنم ہے۔

دنیا کا کوئی نظام یا کوئی سیکولر حکومت آئیڈیالوجی پر استوار نہیں ہوتی۔ نہ ہی سیکولر حکومتوں کا کوئی مطمحِ نگاہ یا کوئی مقصد حیات ہوتا ہے۔ نہ ہی سیکولر حکومتوں کی عوام کو اپنی اپنی حکومتوں سے کوئی محبت یا دلچسپی ہوتی ہے۔ مغربی جمہوریت میں تقریباً آدھی آبادی کے مفادات حکومتِ وقت کے مفادات سے مطابقت نہیں رکھتے۔ اسلامی مملکت کی تو کیفیت ہی مختلف ہوتی ہے اس کے ایک ایک شہری کو حکومت نے خریدا ہوا ہوتا ہے اور اس کے ایک ایک شہری نے اپنے کو اسلامی مملکت کو فروخت کیا ہوتا ہے۔ حکومت اور تمام شہریوں کا ایک مقصد حیات ہوتا ہے، اور دونوں کے ایک ہی مفادات ہوتے ہیں۔ حکومت اور شہریوں کی زندگی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ تمام شہریوں کی نفس یا ذات حد درجہ نشوونما حاصل کرے، اور ہر انسان کی پوری پوری صلاحیتیں بیدار ہو جائیں اور سب شہریوں کو اس دنیا میں جنت کی زندگی حاصل ہو جائے۔ اور اسی دنیا میں جنتی معاشرہ قائم ہو جائے

وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا مَنْ تَزَكّٰى (20:76) اور نفس کا مزکی ہونے کا یہ بدلہ ہے۔

قرآن فہمی میں ایک رکاوٹ جو مسلمانوں کے زوال کا ایک بڑا سبب بنی یہ بھی ہے کہ قرآن نے جو عقائد نظریات ایسے دیئے تھے کہ ان پر عمل کرنا اور ان کے نتائج اس دنیا میں حاصل کرنا ضروری تھے۔ ہم مسلمانوں نے ان عقائد و نظریات کو صرف ذہنی اور فکری حد تک تسلیم کیا۔ اور ان پر عمل درآمد کرنا ضروری اور لازمی نہیں سمجھا۔ دین و مذہب میں فرق ہی یہ ہے کہ اگر آپ ان نظریات پر عمل کرتے ہیں تو یہ دین ہے۔ لیکن اگر آپ ان کو صرف اعتقاد کے طور پر تسلیم کرتے ہیں تو وہ مذہب ہوگا اس کی واضح مثال وہ ارشادِ خداوندی ہے جو حج بیت اللہ کے مقصد کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ ط (22:37) حج بیت اللہ کا انعقاد اس لئے ہوتا ہے تاکہ تم اس راہنمائی کی بنا پر جو تمہیں دی گئی ہے تم خدا کے قوانین جاری کر کے خدا کا غلبہ اور اس کی کبیریائی اس دنیا کے اندر مسلط کر دو۔ اس آیت کا ترجمہ شیخ الہند نے یہ کیا ہے ''اللہ کی بڑائی پڑھو اس بات پر کہ تم کو راہ سمجھائی۔'' اس کے فوائد میں حضرت اقدس مولانا عثمانی نے تحریر فرمایا ''یعنی بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُ اَكْبَر اَللّٰهُمَّ لَكَ وَمِنْكَ '' کہہ کر ذبح کرو اور اللہ کا شکر ادا کرو۔'' اس کے علاوہ عید الفطر اور عید الضحیٰ کی نمازوں میں جو 6 تکبیرات کہی جاتی ہیں۔ وہ اس آیت کا تقاضہ پورا کیا جاتا ہے آپ غور فرمائیں کہاں دین کو ساری دنیا میں غالب کرنا اور کہاں 6 تکبیرات پڑھنا، کس طرح دین کو مذہب میں بدلنا ہے۔

اس سلسلہ کی چند مزید مثالیں ملاحظہ فرمائیں قرآنِ کریم میں جس جگہ بھی اللہ و رسول کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے اس کا مطلب اسلامی مملکت کا مرکز ہوتا ہے (3:32، 4:59، 8:1، 8:20، 8:46 وغیرہ) اور یہ اطاعت ایک ہوتی ہے، مگر ہم نے مذہب میں اس سے مراد قرآن و حدیث کی اطاعت لیا ہے اور اس طرح اطاعتیں بھی دو قرار دے دی گئی ہیں۔ دیگر مقامات پر جہاں صرف اللہ کا مبارک نام استعمال ہوا ہے۔ اس سے اسلامی نظام مراد ہوتا ہے ارشادِ عالی ہے: مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا (2:245)، کون شخص ہے جو اللہ کو قرضِ حسنہ دے، ارشاد ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ (47:7) ترجمہ: اے ایمان والو، اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد فرمائے گا اور تمہارے قدموں کو جما دے گا۔ ظاہر ہے کہ اللہ خود اپنے لئے تو کسی مدد کا محتاج نہیں۔ یہاں اللہ سے مراد اس کا نظام ہے۔ دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا کہ مشرکین و کفار سے مقابلہ کرنے کے لئے ہر طرح کی قوت جمع کرو تاکہ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ (8:60) تاکہ تم اس قوت سے اللہ کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو ڈراؤ۔ اس آیت میں اپنے دشمنوں سے بھی پہلے اللہ کے دشمنوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اللہ کے دشمن وہی لوگ ہیں جو اللہ کے نظام کو قائم کرنے کی مخالفت کرتے ہیں۔

ان مثالوں کو اس لئے پیشِ خدمتِ عالی کیا گیا ہے تاکہ زیرِ غور آیت کے سمجھنے میں سہولت ہو جائے۔

ارشادِ حضرت باری تعالیٰ ہوتا ہے: اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ط

(9:111) ترجمہ: خدا نے مومنین سے ان کی جانیں اور ان کے مال خرید لئے ہیں تا کہ اس کے بدلے میں ان کو جنت دے۔

خرید و فروخت کے معاملے میں پانچ شقیں ضروری ہوتی ہیں۔

(1) خریدار (2) بیچنے والا (3) مال و متاع (4) قیمت (5) خرید و فروخت کی تحریری سند

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان تمام چیزوں کی وضاحت کر دی ہے۔ اپنے آپ کو، اور عملی طور پر اسلامی نظام کو خریدار، مومنین کو بیچنے والا، مومنین کی جان و مال کو مال و متاع Commodity، اور جنت کو اس کی قیمت قرار دیا ہے اس کے بعد قرآن کریم اس معاملہ کی مزید تاکید کرتے ہوئے فرماتا ہے: وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ (9:111) اور چونکہ وہ بھولتا نہیں اور کسی کام کے کرنے سے عاجز نہیں ہے، تو اس سے زیادہ وعدہ وفا کرنے والا اور کون ہو سکتا ہے۔

جیسا کہ اوپر تحریر کیا گیا ہے ہم مسلمان عملی احکام و ضوابط کو ذہنی اور فکری طور پر تسلیم کر کے، ان کی عملی شکل کو Ignore کر دیتے ہیں۔ یہی حال اس آیت کا ہوا ہے اور اس پر نظری طور پر ایمان لانے کو ہی کافی سمجھا گیا ہے۔ ورنہ اصل حقیقت یہ ہے کہ یہاں اللہ سے مراد عملی طور پر اسلامی نظام ہے۔ انسانوں کی دنیا میں اللہ کا کام انسانوں کے ذریعے ہی پورے کرائے جاتے ہیں۔ اللہ کا یہ اعلان کہ ہم اپنے کلمہ کو بلند کریں گے اور اللہ کا دین غالب آ کر رہے گا۔ یہ انسان کے ہاتھوں ہی غلبہ حاصل ہوگا۔ اس آیت میں یہی مراد ہے کہ جب اسلامی نظام قائم ہوتا ہے تو عوام کی ساری چیزوں، حتیٰ کہ ان کے جان و مال کی مالک بھی مملکت ہو جاتی ہے اور اس کے بدلہ میں یہ معاشرہ جنتی معاشرہ ہو جاتا ہے۔ حضور ﷺ کے دور میں یہی ہوا۔ جو لوگ مسلمان ہو رہے تھے۔ ان کی جائیدادیں اور زمینوں کی ملکیت ریاست کی طرف منتقل ہو جاتی تھی۔ اور اس کے بدلے میں جنتی معاشرہ قائم ہو گیا تھا۔ ہمارے مفسرین نے اس آیت کو فکری حد تک قبول کیا اور جنت سے مراد آخرت کی جنت کو قرار دیا۔ لیکن یہ بات درست نہیں ہے۔ جب معاہدہ کی ساری شقیں اس دنیا میں محسوس طور پر موجود ہیں کہ نظام خریدتا ہے، مومنین فروخت کرتے ہیں، جان و مال بحیثیت ایک Commodity موجود ہوتا ہے، تو جنت بھی اس کے بدلے اسی دنیا میں ملنی چاہئے، تا کہ آیت کی صداقت بھی سامنے آ کر چمکنے لگے حضور ﷺ کے دور کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ حضور ﷺ نے جنتی معاشرہ قائم فرمایا اور اپنی مملکت کے متعلق فرمایا کہ میں تمہارے میں ایک ایسی مملکت چھوڑے جا رہا ہوں کہ جس کی راتیں بھی دن کی طرح روشن ہوتی ہیں۔ حضور ﷺ کے دور کے کفار و مشرکین حضور ﷺ کے سامنے بار بار یہ اعتراض کرتے تھے کہ اگر آپ ﷺ واقعاً اللہ کے رسول ہیں تو آپ ﷺ کے پاس انگوروں اور کھجوروں کا باغ ہونا چاہئے تھا۔ جس میں ندیاں بہتی ہوں اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ﴿٩١﴾ (17:91)، اس کے جواب میں قرآن نے فرمایا یہ کفار و مشرکین ایک باغ کا مطالبہ کر رہے ہیں، خدا تو تمہیں باغات عنایت کرے گا وَيَجْعَلْ لَّكَ قُصُوْرًا (25:10) اس کے علاوہ محلات بھی ہوں گے۔ یہ ہے وہ جنت جو حضور ﷺ نے اپنے دور میں قائم فرمائی تھی۔

اسی دنیاوی جنت کا ذکر قرآنِ کریم نے سورہ الصّف میں فرمایا ہے جبکہ کہا کہ اے مومنین کیا میں تمہارے لئے ایک ایسی تجارت کی نشاندہی کردوں جو تمہیں عذاب الیم سے بچادے اور وہ تجارت یہ ہے کہ تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اپنی جان و مال کے ساتھ اس کی راہ میں جہاد کرو۔ تم دیکھو گے کہ یہ تجارت کس قدر نفع بخش ہے۔ اس سے تمہاری کوتاہیوں کے نقصان دہ نتائج دور ہوجائیں گے اور اللہ تمہیں ایسے باغات میں داخل کرے گا جن کے نیچے ندیاں جاری ہوں اور تمہارے لیے بہترین مساکن ہوں گے اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے جو تمہیں حاصل ہوئی (61:12-10)۔

حضور ﷺ کے ہی دور میں آپ ﷺ کے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی سرتوڑ کوششوں کی وجہ سے حضور ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھیوں کو کفار کی زمینوں اور ان کی بستیوں اور ان کے مال و دولت کا ان کو مالک بنادیا تھا: وَاَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ وَاَرْضًا لَّمْ تَطَـُٔوْهَا ؕ (33:27) چنانچہ جب حضور ﷺ اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو یہ فتوحات حاصل ہوئیں تو انہوں نے شکر خداوندی ادا کیا۔ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ وَاَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَآءُ ۚ فَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ﴿۷۴﴾ (39:74) ترجمہ: (شکر الٰہی ادا کرتے ہوئے) وہ کہتے تھے کہ اللہ کا شکر ہے جس نے ان وعدوں کو پورا کیا جو اس نے ہمارے ساتھ کئے ہوئے تھے اور ہمیں اس طرح اس ملک کا وارث بنایا کہ ہمیں اس جنت میں پورا پورا اختیار حاصل ہے۔ آپ غور فرمائیں کہ اورثنا الارض کے الفاظ لاکر قرآن نے واضح کردیا کہ یہ جنت اسی زمین پر تھی۔

صلح حدیبیہ جو فتح مکہ کی ایک خوش خبری ہی تھی اس کے متعلق فرمایا: لِّيُدْخِلَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (48:5) تاکہ (فتح مکہ کے بعد) اللہ مومنین و مومنات کو ان باغات (جنت) میں داخل کرے گا جن کے نیچے پانی رواں ہے اور تاکہ ان کے مخالفین کو شکست کا عذاب ملے۔ یہ نتائج صلح حدیبیہ کے بارے میں ارشاد ہوئے ہیں جو مکہ میں عملی شکل میں واضح ہوئے۔

سیکولر حکومت کا مقام خود مقصود بالذات ہوتا ہے اسلامی مملکت کا قیام مقاصد عالی کے حصول کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں ہم نے اوپر تحریر کیا تھا کہ اسلامی مملکت کے شہریوں کی جان و مال اسلامی ریاست کی Disposal پر ہوتی ہے کیونکہ ریاست ان کی جان و مال خرید لیتی ہے (9:111) جبکہ اس ریاست کے شہری خود اپنے آپ کو ریاست کے ہاتھوں فروخت کردیتے ہیں۔ ریاست جس طرح شہریوں کے جان و مال خریدتی ہے اور ان کو اس دنیا میں بہترین جنتی معاشرہ عنایت کردیتی ہے اس کی تفصیل ہم نے پیش خدمتِ عالی کردی ہے۔ مومنین خود اپنے آپ کو اس ریاست کے ہاتھوں جو فروخت کرتے ہیں، اب اس کی تفصیل پیش خدمت عالی کی جاتی ہے۔

تقریباً سب تعلیم یافتہ حضرات کو صلح حدیبیہ کے حالات معلوم ہیں۔ اس لئے ہم ان کی تفصیل میں نہیں جاتے۔ ہم صرف

اسی قدر تحریر کرتے ہیں جو اس بارے میں جاننا ضروری ہے۔ حضور ﷺ کو عمرہ کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ حضور ﷺ نے اس سلسلہ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو کفار سے گفت وشنید کرنے کی غرض سے بھیجا، تاکہ گفتگو کے ذریعے کوئی مفاہمت کا طریقہ برآمد ہو۔ اس دوران یہ افواہ پھیل گئی کہ مشرکین نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا اور حالات ہر طرح سے جنگ کے لئے ناگزیر بن گئے، تو حضور ﷺ نے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے تجدید بیعت کرنا مناسب سمجھا۔ اس زمانہ میں یہ طریقہ تھا کہ بیعت کرنے والا آتا تھا اور خریدنے والے کے ہاتھ پر ہاتھ مارتا تھا اور اس طرح بیعت کی توثیق کر دیتا تھا۔ اب جب حضور ﷺ نے تجدید بیعت کا اعلان فرمایا تو صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین توثیق بیعت کے لئے آئے اور وہ حضور ﷺ کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر بیعت کی توثیق کر رہے تھے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ حضور ﷺ کے ہاتھ کی بیعت ہو رہی تھی۔ حالانکہ یہ اللہ کی طرف سے بیعت ہو رہی تھی جو عملی طور پر اسلامی مملکت کی طرف سے ذمہ داری لی جاری تھی۔ ہم چونکہ اللہ کو دیکھ ہی نہیں سکتے۔ نہ اس کے ہاتھ کو پا سکتے ہیں اس لئے ارشاد ہوا اِنَّ الَّذِیۡنَ یُبَایِعُوۡنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوۡنَ اللّٰہَ ؕ (48:10)، اے رسول یہ لوگ جو تیرے ہاتھ پر بیعت کر رہے ہیں اِنَّمَا یُبَایِعُوۡنَ اللّٰہَ ؕ یہ بیعت تمہارے ہاتھ پر نہیں ہو رہی یہ خدا کے ہاتھ پر بیعت ہو رہی ہے نیز آگے فرمایا: یَدُ اللّٰہِ فَوۡقَ اَیۡدِیۡہِمۡ ۚ ان کے ہاتھوں کے اوپر تیرا ہاتھ نہیں یہ خدا کا ہاتھ ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کرنا خود کو اس نظام کے ہاتھ فروخت کرنا تھا۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اسلامی ریاست کے باشندے، اسلامی ریاست سے کس درجہ وفادار، اس کے مطیع ہوتے ہیں۔ عام ریاستیں اس لیے وجود میں لائی جاتی ہیں کہ ان میں انسانوں کو زندگی بسر کرنے کی سہولت مہیا کر دی جائے۔ اس کے باشندے اپنی زندگی سہولت سے بسر کر سکیں۔ لیکن اسلامی مملکت کا مقصد صرف اتنا ہی نہیں ہوتا۔ اسلامی مملکت کا فرض یہ سہولتیں مہیا کرنا تو یقیناً ہے لیکن اصل مقصد اسلامی مملکت کے قیام کا یہ ہوتا ہے کہ اس مملکت میں رہ کر انسان کی نفس زیادہ سے زیادہ مضبوط و مستحکم ہو جاتی ہے اور اس کی صلاحیتیں پوری طرح نشوونما حاصل کر لیتی ہیں۔ غیر اسلامی معاشرہ میں نفس انسانی ترقی نہیں کر سکتی۔ کیونکہ جس طرح انسانی جسم طبعی قوانین کے ماتحت زندگی بسر کرتا ہے، اسی طرح نفسِ انسانی کی نشوونما کے لئے بھی قوانین مقرر ہیں جن کو مستقل اقدار کہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں عطا فرمائے ہیں۔ مستقل اقدار ذہن انسانی وضع نہیں کر سکتا۔ یہ صرف وحی الٰہی کے ذریعے ہی حاصل ہو سکتی ہیں۔ نفس انسانی کی نشوونما کے طریقے انسان وضع نہیں کر سکتا۔ اس کی نشوونما صرف اللہ تعالیٰ کے قوانین کے مطابق ہی ہو سکتی ہے۔ فرمایا: اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ یُزَکُّوۡنَ اَنۡفُسَہُمۡ ؕ بَلِ اللّٰہُ یُزَکِّیۡ مَنۡ یَّشَآءُ وَلَا یُظۡلَمُوۡنَ فَتِیۡلًا ﴿۴۹﴾ (4:49) ترجمہ: کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو اپنے آپ کو پاکیزہ کہتے ہیں۔ لیکن اللہ ہی پاکیزہ کرتا ہے جسے وہ چاہے اور ان پر ایک تاگے کے برابر ظلم نہیں ہوگا۔ مسلمانوں پر خدا کا قہر اور عذاب اس وجہ سے بھی آ رہا ہے کہ ہم نے اوّل تو نفس کے تصور کو روحِ انسانی کے تصور سے تبدیل کیا۔ قرآنِ کریم نے

روح انسانی کی تردید کی۔ لیکن ہم مسلمانوں نے نفس انسانی کے بدلہ روحِ انسانی کا عقیدہ اختیار کیا، اور اس کی نشوونما دینے کے طریقے خود وضع کئے۔ روحِ انسانی کی نشوونما کے تمام طریقے وہ وضع کئے جس سے کوئی بھی قوم اگر اس پر عمل کرے تو وہ زوال پذیر ہوجاتی ہے۔ انہوں نے کائنات کے وجود سے انکار کیا۔ عقل کے ذریعے جو علم حاصل کیا جاتا ہے اس کی مذمت وتنقیض کی اور علم حاصل کرنے کا ذریعہ باطنی ذرائع کو قرار دیا۔ معاشرہ اور مملکت کی ضرورت سے انکار کیا اور اطاعتِ خداوندی کو ترک کرکے، پرستشِ خدا کی راہ اختیار کی۔ اب ساری اہمیت پرستش کو دی گئی جو جنگلوں، پہاڑوں، گوشوں، کونوں میں کی جاتی ہے۔ حیرانی یہ ہے کہ قرآنِ کریم جس تصور کا قائل ہی نہیں، اور اس کی تردید کرتا ہے۔ ہم نے مذہب کی ساری عمارت روح کے تصور پر استوار کی، اور پرستش کو اس کا ذریعہ بنایا۔ اس کی وجوہات کیا تھیں اور روح کو اتنی اہمیت کیوں دی گئی، یہ کسی دوسرے مضمون میں پیش خدمت عالی کی جائیں گی۔

قرآنِ کریم مملکت کی اساس نفس انسانی پر رکھتا ہے۔ اس کی نشوونما کو زندگی کا مقصد ٹھہراتا ہے۔ اس کی نشوونما مستقل اقدار پر عمل کرنے سے ہوتی ہے۔ مستقل اقدار کا اجراء اور اس کا نفاذ صرف اسلامی مملکت میں ہوسکتا ہے اس لئے اسلامی مملکت کا قیام نہایت ہی ضروری ہوتا ہے۔ یہ بات بھی واضح رہے لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا ط (2:286) اللہ تعالیٰ کے احکامات کی اطاعت سے نفس انسانی کی پرورش ہوتی ہے لہٰذا ان احکامات کو کسی ظالم حاکم کی طرف سے، کسی ڈکٹیٹر کی طرف سے عائد کردہ جکڑ بندیاں نہ خیال کیا جائے بلکہ جس قدر احکامات خداوندی کی اطاعت کرتے چلے جائیں گے، اسی قدر آپ کے نفس کی ترقی ہوتی چلی جائے گی۔ انسانوں کے واضع کردہ قوانین معاشرہ کی تعمیر میں کوئی حصہ نہیں لیتے۔ لیکن قرآن کریم کے احکامات کی اطاعت معاشرے کی تعمیر میں ایک مثبت کردار ادا کرتی ہے۔

چونکہ ہر فرد کا مقصود زندگی نفس کی ترقی ہے اس لئے ہر شخص وہ کام کرے گا جس سے اس کی نفس میں ترقی ہو، وہ لوگوں پر ایثار کرے گا۔ وہ اپنی کمائی کا بیشتر حصہ دوسروں پر صرف کرے گا، وہ ناداروں، مسکینوں، مفلس ومحتاج لوگوں کی مدد کرے گا، وہ زیادہ سے زیادہ انسانیت کی خدمت کرے گا، تاکہ اس کی نفس مزکی ومجلیٰ ہو، وہ جرائم سے اجتناب کرے گا، وہ جھوٹ سے بچے گا، وہ چوری نہیں کرے گا وہ کسی کا حق نہیں مارے گا وہ جو کام بھی اپنی نفس کی بہبودی کے لئے کرے گا، اس سے معاشرہ از خود بہتر سے بہتر ہوتا چلا جائے گا۔ اس معاشرے میں کوئی شخص اس لئے جرم نہیں کرے گا کہ جرم کے ارتکاب سے اس کے نفس پر بُرا اثر پڑے گا۔ اس معاشرہ میں خود بخود انسداد جرم ہوجاتا ہے۔

ہمارے معاشروں میں لوگوں کو نفس پر اثرات مرتب ہونے کا یقین نہیں ہے۔ ایک آدمی جس قدر بھی بھوکا ہو اور آپ اس کو بہترین کھانا پیش کریں اور ساتھ میں یہ کہہ دیں کہ اس میں زہر ملا ہوا ہے تو وہ بھوکا آدمی وہ کھانا نہیں کھائے گا اسے اس بات کا علم ہے کہ زہر کھانے سے موت واقع ہوجاتی ہے۔ اگر کسی کو اتنا ہی یقین ہو کہ حرام مال کھانے سے نفس میں اضمحلال

پیدا ہوتا ہے تو وہ شخص حرام مال نہیں کھائے گا۔

یہ مضمون ہم نے یہاں ختم کیا۔ اور اس کو یہ شرف حاصل ہوا کہ جناب نے اس کو ملاحظہ سے گزارا۔

عرصۂ دراز سے Political Thought مشرق میں بھی ہے اور مغرب میں بھی۔ ہمارے ہاں مشرق میں مسلمانوں میں ابن خلدون، الماوردی، جلال الدین رومانی اور سینکڑوں مفکرین نے سیاسی فکر پر کتابیں تحریر کیں۔ مغرب میں Locke Hobbes، روسو اور بے شمار مفکرین نے سیاسی نظریات پیش کئے۔ جو قرآن کریم کے سامنے بچوں کا کھیل معلوم ہوتے ہیں۔ انقلاب فرانس کے بعد ایک نئے انداز سے سیاسی فکر پیش کیا گیا۔ آخر میں کمیونسٹوں نے مارکس، ہیگل اور اینگلز وغیرہ نے سیاسی فکر پیش کیا افسوس اس بات کا ہے کہ فکر انسانی آج تک کوئی ایسا نظام پیش نہیں کر سکا جس میں انسانیت کے تمام تقاضے پورے ہوتے ہوں۔ انسانوں نے تمام ہی نظام آزما لئے لیکن ایک بھی انسانیت کے معیار پر پورا نہیں اترا۔

قرآن کریم چونکہ انسانیت کے تمام مسائل حل کرنے کا نہ صرف دعویٰ کرتا ہے بلکہ ان مسائل کو حل کرنے کی ذمہ داری بھی لیتا ہے۔ اس لئے قرآن نے بھی ایک نظام پیش کیا جس کو حضور ﷺ نے اپنے مبارک دور میں مدینہ میں جاری کیا۔ انسانیت کی بدقسمتی کہ وہ نظام چند واضح وجوہ کی بناء پر منقرض ہو گیا اور مسلمانوں نے اس قسم کے خلاف قرآن عقائد اختیار کر لئے جن عقائد کے ہوتے ہوئے اسلامی نظام قائم نہیں ہو سکتا۔ اس وقت چونکہ مسلمان اور خاص طور پر ہماری پیشوائیت ان عقائد کو چھوڑنے کو تیار نہیں اس لئے اس وقت کسی اسلامی ملک میں اقامت دین کا کوئی دور دور امکان نہیں۔

قرآن کریم چودہ سو سال سے ہم مسلمانوں کے سامنے موجود ہے۔ اسی قرآن کریم میں روح انسانی، اور روحانیت کی تردید اور ذات یا نفس انسانی، کا نظریہ اور اس کے نشوونما کے طریقے موجود ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اقامت دین کی فرضیت بھی واضح طور پر موجود ہے (42:13) ہر رسولؑ پر دین کا قائم کرنا لازمی تھا اور ختم نبوت کے بعد ہر مسلمان پر اقامت دین فرض ہو گئی ہے (5:44، 5:46) لیکن افسوس کہ مسلمانوں نے قرآن کے ان عقائد کو اس طرح پس پشت ڈالا گویا ان کا قرآن کریم سے کوئی واسطہ ہی نہیں ہے۔ تحریکِ طلوعِ اسلام پہلی تحریک ہے اور جناب غلام احمد پرویز مرحوم پہلے عالم دین / مفکر ہیں جنہوں نے قرآنِ کریم پر غور و فکر کرنے کے بعد اقامت دین اور نفس انسانی کا تصور پیش کیا اور موجودہ دور کے مسلمانوں کی از اوّل تا آخر فکری تغلیط تردید کر کے اس پر خط نسخ پھیر دیا ہے فکر انسانی نے آج تک کوئی ایسا نظام وضع ہی نہیں کیا جس میں اس نظام کی اساس بنائی گئی ہو۔ انسانی فکر کا پیش کردہ آخری نظام کمیونزم ہے چونکہ اس نظام میں بھی کوئی اساس نہیں تھی تو علامہ نے برملا ارشاد فرمایا:

ای کہ می خواہی نظام عالمے
جستہ او را اساس محکمے؟

اساس محکم نہ ہونے کی وجہ سے کیمونزم ناکام ہوگیا۔ اسلامی نظام وہ ایک واحد/منفرد نظام ہے۔ جو اساس محکم پر قائم ہوتا ہے اور چونکہ یہ نظام انسانیت کے تمام تقاضے پورا کرتا ہے، اب جو حضرات انسانیت کی خدمت کرنا چاہتے ہیں ان کا فرض ہے کہ وہ اس تحریک کا ساتھ دیں۔ مسلمان ہی ہماری آنکھوں کا نور اور دل کا سرور ہیں اس لئے دل یہی چاہتا ہے کہ مسلمان ہی اس دین کو کسی ملک میں قائم کرلیں۔ لیکن بظاہر امید بالکل معدوم ہے۔ ہمارے عوام اسلام پر جان دیتے ہیں۔ مسلمان کی بدبختی یہ ہے کہ ساری دنیا میں مسلمانوں کی لیڈرشپ، خودغرض، مفاد پرست، ڈاکو اور اقتدار پرست ہے۔ یہ اقتدار چھوڑنے کی بجائے مرنے کو پسند کرتے ہیں۔ آپ کے سامنے اس کی کئی مثالیں موجود ہیں۔ محض اقتدار کی خاطر جان کا خطرہ مول لے لیتے ہیں۔ اسلامی نظام کے قیام کا سب سے زیادہ امکان پاکستان میں تھا یہاں ہمیں Clean Chit ملی تھی لیکن یہاں کے لیڈروں کے احوال آپ کے سامنے ہیں۔ ایک سے زیادہ ایک لٹیرا ہے اور اقتدار چھوڑنے کو تیار نہیں خواہ پاکستان ہی ختم ہوجائے اس کی اُن کو کوئی پروا نہیں۔ انہوں نے ہی اس میں ہی سب کو ایک دوسرے کے سامنے برہنہ کردیا ہے جس ملک کے دانشور intellectuals بھی بددیانت اور لٹیرے ہوجائیں اس ملک کا اللہ ہی حافظ ہے۔ رہ گئے علماء کرام تو وہ روحانیت اور تصوف میں ڈوبے ہوتے ہیں۔ وہ اسلامی نظام کے قیام کو اہمیت ہی نہیں دیتے۔ پھر ان حالات میں دین کیسے قائم ہوسکتا ہے۔ اس وقت ساری دنیا میں ایک گز زمین پر اللہ کی حاکمیت قائم نہیں ہے۔ چاروں طرف اندھیرا چھایا ہوا ہے (30:41) جب بدر کی لڑائی ہوئی ہے اس وقت بھی چاروں طرف ایسا ہی اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ حضور ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے اس لڑائی میں فتح نصیب ہونے کی دعا فرمائی تھی اور فرمایا تھا کہ اگر آج مسلمانوں کو شکست ہوگئی تو تیرا نام لینے والا کوئی نہیں رہے گا۔ وہی حالات آج ہیں اگر اس وقت تحریکِ طلوعِ اسلام ناکام ہوگئی صدیوں اقامتِ دین کا امکان نظر نہیں آتا۔ اس لئے تمام مسلمانوں سے خصوصاً علماء کرام سے درخواست ہے کہ وہ اس تحریک کا ساتھ دیں۔

اس مضمون میں جو کچھ تحریر کیا گیا ہے وہ اس تحریک کا منفرد نظریہ ہے۔ ہمیں اس بات کا اعتراف ہے یہ Unique Theme، اس درجہ مضبوط اور Forcefully پیش نہیں کیا جاسکا جو اس کا حق ہے۔ کیونکہ ذات انسانی کو نظام کی اساس سمجھنا بہت اعلیٰ تصور اور نہایت قابل قدر نظریہ ہے۔ ذات کی نشوونما اسلامی نظام میں ہی ہوسکتی ہے۔ مستقل اقدار پر عمل کرنے اور صفاتِ خداوندی کو اپنے اندر منعکس کرنے، اور ریاست میں منعکس کرنے سے نفس انسانی کی تربیت ہوتی ہے۔ اُمید ہے کہ مستقبل میں کوئی بلند پایہ سکالر اس نظریہ کو زیادہ اچھی طرح پیش کرسکے اور یہ نظریہ قبول عام اختیار کرے گا۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ اللہ کا دین غالب آکر رہے (61:9، 48:28، 9:33) وہ خود اس کو غالب لانیوالوں کی مدد فرمائے گا (22:40، 47:7)۔

ڈاکٹر سیّد عبدالودود

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اللہ تعالیٰ کا محیر العقول نظامِ ربُوبیت

محترم ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب نے قرآنِ کریم کی بلند پایہ علمی اصطلاحات کا مفہوم، سائنٹفک تحقیقات کی روشنی میں واضح کرنے کا جو انداز اختیار فرمایا تھا وہ انتہائی دلچسپ بھی ہے اور معلومات افزا بھی۔ زیرِ نظر مضمون میں، انہوں نے اللہ تعالیٰ کے محیر العقول نظامِ ربوبیت کے بعض دقیق گوشوں کی نقاب کشائی کی ہے۔

(ادارہ)

میں نے اپنے سابقہ مقالہ میں (جو طلوعِ اسلام بابت مارچ 1980ء میں شائع ہوا ہے) آیات (12-41:9) کے ان گوشوں کے متعلق گفتگو کی تھی جن کا تعلق تخلیق ارض وسمٰوٰت سے تھا۔ ان آیات میں کچھ اہم نکات نظامِ ربوبیت سے بھی متعلق ہیں۔ اب میں ان کے متعلق اپنی تحقیق کے نتائج پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں۔

وَبٰرَكَ فِيۡهَا وَقَدَّرَ فِيۡهَآ اَقۡوَاتَهَا (41:10):

جیسا کہ میں اپنے سابقہ مقالہ میں بیان کر چکا ہوں، یہ الفاظ زمین کے بے جان مادہ میں زندگی کی نمود سے متعلق ہیں ''وَبٰرَكَ'' کا لفظ بڑا جامع ہے۔

اس کے معنی ایسے ثبات کے ہیں جس کے ساتھ نمو بھی ہو۔ یعنی ایک چیز اپنے مقام پر مستحکم بھی ہو اور ساتھ ہی بڑے بھی رہی ہو، اور اس کی مضمر صلاحیتیں نمودار ہو کر سامنے آ رہی ہوں۔ چنانچہ لفظ ''برکۃ'' میں ثبات، استحکام، کثرت، نشوونما اور ظہور و نمود کے تمام پہلو آ جاتے ہیں۔ (لغات القرآن از پرویزؒ)

سائنس آف بائیالوجی (علم الحیات) کی ایک اصطلاح ہے (Self Perpetuation) جس کے معنی بعینہٖ وہی ہیں جو لفظ ''برکت'' کے ہیں۔ یہ سوال ابھر کر سامنے آ جاتا ہے کہ زندہ اشیاء میں وہ کیا قدرِ مشترک ہے جس سے پہچانا جا سکے کہ یہ اشیاء زندہ ہیں۔ جہاں تک کیمیائی عناصر کا تعلق ہے، وہ زندہ اور بے جان اشیاء میں ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔ زندہ شے، چاہے ایک جرثومہ (Cell) پر مشتمل ہو چاہے اربوں (Cells) پر، ان سب کے افعال (Activities) ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔ یعنی:

(1) NUTRITION: اپنے ماحول سے خام مادے کا حصول۔

(2) RESPIRATION: اپنے ماحول سے انرجی (توانائی) کا حصول۔

(3)Self-Repair: خام مادے (غذا) اور انرجی کے ذریعے اپنے جسم کے اجزا نئے سرے سے تیار کرنا۔ ٹوٹے پھوٹے کی مرمت کرتے جانا۔

(4)GROWTH: نئے تیار کردہ اجزاء سے جسم کا بڑھنا۔

(5)DEVELOPMENT: نئے اجزاء کے ذریعے نئی خصوصیات کا پیدا ہونا۔

(6)ADAPTATION: یعنی بدلے ہوئے ماحول میں اپنے جسم میں تبدیلی پیدا کر کے اپنے بقاء کی خاطر نئے ماحول کا مقابلہ کرنا۔

ان افعال کو دو گروپوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(1)METABOLISM اور (2)SELF-PERPETUATION، Metabolism میں خام مادہ کا حصول، انرجی کا حصول، اور جسم کے اجزاء کی تعمیر شامل ہیں۔ اس میں سے کچھ انرجی جسمانی ساخت کی تعمیر میں خرچ ہوتی ہے اور باقی (Self-Perpetuation) کے کام آتی ہے۔

اب آپ غور کیجئے کہ اگر ایک مشین کو خام مال اور انرجی (پٹرول یا کوئلہ یا بجلی) مہیا کر دی جائے تو مشین بھی اپنے پرزے خود تیار کر سکتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ صرف (Metabolism) ایسا فعل نہیں جس سے زندہ چیز، بے جان چیز سے متمیز ہوتی ہے۔ دراصل امتیازی فعل (Self-Perpetuation) ہے۔

Self-Perpetuation پھر تین افعال پر مشتمل ہے:

(1)Steady State Control، (2)Reproduction تولید اور (3)Adaptation بدلے ہوئے ماحول کے مطابق بدلنا۔ (Steady State Control)۔ ایک جاندار کے اندر بے شمار پیچیدہ کنٹرول سسٹم ہوتے ہیں جن کے ذریعے وہ اپنے داخلی اور خارجی ماحول سے آگاہ رہتا ہے۔ اسے یہ آگہی محرکات (Stimuli) کے ذریعے حاصل ہوتی ہے جن کا ردِعمل (Self Preservation) یعنی تحفظ خویش کی شکل میں ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ہمارے جسم میں جب غذا ختم ہو جاتی ہے، تو بھوک لگتی ہے، پانی ختم ہو جائے تو پیاس لگتی ہے۔ جس کام کے کرنے میں زیادہ قوت صرف ہو اس سے آکسیجن ختم ہو جاتی ہے جسے حاصل کرنے کے لئے سانس تیز ہو جاتی ہے۔ جسم، خوراک، پانی، آکسیجن اسی قدر حاصل کرتا ہے جس قدر اسے ضرورت ہوتی ہے۔ ضرورت پوری ہونے کے بعد بھوک پیاس بھی ختم ہو جاتی ہے اور تنفس بھی معمول پر آ جاتا ہے۔ (اس ''بقدرِ ضرورت'' حصول کو پیشِ نظر رکھئے تا کہ آگے چل کر لفظ ''اقواۃ'' کے معنی واضح ہو جائیں)

REPRODUCTION۔ (Steady State Control) کے باوجود ہر جاندار کی طبیعی زندگی کی ایک حد ہے، کیونکہ (Control Systems) میں (Wear and Tear) بوسیدگی اور فرسودگی کا عمل ہر وقت جاری رہتا ہے۔ اگر چند ایک کنٹرول سسٹمز خراب ہو جائیں، تو جاندار بیمار ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں باقی سسٹمز (Selfrepair)

کا کام دیتے ہیں۔ اگر سارے کے سارے کنٹرول سسٹمز خراب ہوجائیں تو اس کی موت واقع ہوجاتی ہے۔ یہاں پھر ایک مشین اور زندہ شے میں مماثلت پائی جاتی ہے۔ جس طرح مشین ایک عرصہ کے بعد بیکار ہوجاتی ہے اسی طرح جاندار کا جسم بھی بیکار ہوجاتا ہے لیکن جاندار کی زندگی میں ایک ایسا واقعہ ظہور پذیر ہوتا ہے جو مشین کے دائرہ کار سے باہر ہے۔ یہ ہے (Reproduction) یا تولید کا عمل۔ گویا تولید کا عمل ایک لحاظ سے موت کا بدل ہے۔ اس کے ذریعے زندگی آئندہ نسلوں میں جاری رہتی ہے۔ یعنی فردِ متعلقہ کی طبیعی زندگی نہیں بلکہ محض زندگی۔۔۔ (LIFE-ADAPTATION) یہ زندگی کے ثبات اور استحکام کو قائم رکھنے کی آخری تدبیر ہے۔ یہ سمجھ لینا چاہئے کہ ماحول میں جو طویل المیعاد (LONG-RANGE) تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں، (STEADY STATE CONTROL) اور عملِ تولید، دونوں مل کر بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ مدت مدید کے بعد آب وہوا بدل سکتی ہے۔ زمین کی خشکی تری میں اور تری خشکی میں تبدیل ہوسکتی ہے۔ جنگل کی جگہ ریگستان اور ریگستان کی جگہ جنگل بن سکتے ہیں۔ فلہٰذا، ایک طویل مدت کے بعد نئی نسلیں بدلے ہوئے ماحول میں زندہ نہیں رہ سکتیں، تآنکہ ان کے جسم میں ایسی تبدیلی نہ آجائے جو بدلے ہوئے ماحول کا مقابلہ کر سکے۔ یہ تبدیلی (SEX) نر و مادہ کے اختلاط اور (MUTATION) یکسر نئے اجزاء کے معرضِ وجود میں آنے سے پیدا ہوتی ہے۔ (تفصیل میری کتاب میں ملے گی (1))

یہ ہے (Self Perpetuation) کا وہ عمل جسے قرآن نے ایک لفظ (برکۃ) میں سمٹا کر رکھ دیا ہے۔ یہ ہے قرآن کا اندازِ بیان اور اس کا اعجاز!

(2) وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا (41:10):

اقوات، القوت کی جمع ہے۔ لغات القرآن میں اس کے معانی دیئے گئے ہیں: ''اتنی خوراک جس سے انسان زندہ رہ سکے'' (یعنی خوراک کا حصول بقدرِ ضرورت اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے) میں اس مقالہ میں لفظ خوراک یا غذا ہی استعمال کروں گا کیونکہ یہ عام فہم ہے ورنہ (BIOLOGY) میں (FOOD) اور (NUTRITION) دو الگ الگ اصطلاحات ہیں۔ (NUTRITION) ماحول سے براہِ راست حاصل کی جاتی ہے، جس طرح پودا کرتا ہے لیکن حیوانات اپنی خوراک ماحول سے خام مادہ لے کر تیار نہیں کرتے۔ بعض حیوان پودوں کی شکل میں بنی بنائی خوراک کھاتے ہیں۔ انسان پودے اور حیوان دونوں کو کھاتا ہے۔ پودے اور حیوان کا یہ فرق اسی وقت پیدا ہوگیا تھا جب زندگی ہنوز ایک ہی (Cell) پر مشتمل تھی۔ جو (Cells) اپنی خوراک خود خام مادہ سے تیار کرتے تھے ان کی نسلیں آگے جا کر پودے بن گئیں اور جن (Cells) کی خوراک کا انحصار دوسرے (Cells) پر تھا ان کی آئندہ نسلیں حیوانات بن گئیں۔

زمین پر خوراک کے حصول کے طریق مختلف زمانوں اور مختلف ماحول میں بدلتے گئے۔ اللہ کی ربُوبیت کی یہ داستاں

(1) Phenomena of Nature and the Quran

بڑی طویل ہے لیکن میں اسے مختصراً بیان کرتا ہوں۔

زمین کے سورج سے الگ ہونے کے (3000) ملین سال بعد، اوّلیں جرثوماتِ حیات (Life Cells) پیدا ہوئے۔ جب یہ ایک مرتبہ معرضِ وجود میں آ گئے تو ان کی تعداد میں بڑی تیزی کے ساتھ اضافہ ہونے لگا تا آنکہ ایک وقت ایسا آیا کہ سمندروں کے پانی میں خام مادہ، جو ان کی خوراک تھی، میں کمی واقع ہوگئی۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے (Cells) نے ایک دوسرے کو کھانا شروع کر دیا۔ اور یہ تین طریقوں سے ہوا۔ (1) بعض چھوٹے (Cells) بڑے (Cells) کے جسم میں داخل ہو کر ان کی خوراک کھاتے رہے۔ اس عمل کا نام (Parasitism) ہے۔ بعض (Cells) نے دوسرے مردہ (Cells) کو کھانا شروع کر دیا۔ اسے (Saprotrophism) کہتے ہیں اور بعض بڑے (Cells) نے چھوٹے (Cells) کو کھانا شروع کر دیا اس کا نام (Holotrophism) ہے۔ لیکن ان تینوں طریقوں سے زمین کے خوراک کے مجموعی ذخائر میں کوئی اضافہ نہ ہوا۔ ظاہر ہے کہ اگر یہی عمل جاری رہتا تو کچھ عرصہ کے بعد زمین پر سے زندگی ناپید ہو جاتی۔ لیکن رب العالمین کو یہ منظور نہ تھا کیونکہ زندگی نے ابھی بے شمار منزلیں طے کرتے ہوئے آگے بڑھنا تھا۔ چنانچہ زمین پر خوراک کے نئے (Sources) کے ارتقاء کا عمل شروع ہو گیا۔ زمین کے اولین (Life Cells) کی خوراک، میتھین، ایمونیا اور پانی کے مرکب سے بنی تھی اور اس کی تیاری کے لئے انرجی سورج کی شعاعوں سے اور بادلوں کی بجلی سے لی گئی تھی۔ لیکن بعد ازاں جب فضا کے بخارات ٹھنڈے ہو کر پانی بن گئے اور ہزاروں برس تک مسلسل بارش سے سمندروں کے پانی میں تبدیل ہو گئے تو بادلوں کی بجلی آہستہ آہستہ ناپید یا کم ہوگئی۔ دوسری طرف زمین کے (Atmosphere) میں کاربن ڈائی اوکسائڈ کی تہہ جم گئی جو اس (High Energy Radiation) کے راستے میں جو سورج سے زمین پر آتی تھی روک بن گئی۔ ظاہر ہے جب تک نئی انرجی دستیاب نہ ہو نئی خوراک تیار نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ بعض Cells نے گندھک، لوہا اور نائٹروجن کے مرکبات سے انرجی حاصل کرنا شروع کر دی۔ اس عمل کو Chemosynthesis کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ سورج کی روشنی کی شعاعوں سے انرجی حاصل کرنے کا ایک پیچیدہ لیکن دلچسپ ذریعہ پیدا ہو گیا۔ یعنی ایک مرکب وجود میں آیا جسے Chlorophyll کہتے ہیں اور جو آج بھی روشنی کی شعاعوں سے انرجی حاصل کر کے پودے کی ہوا سے حاصل کردہ کاربن ڈایا اوکسائڈ اور زمین سے حاصل کردہ پانی اور نمکیات کو کاربوہائیڈریٹ میں تبدیل کرتا ہے جو پودوں کی خوراک ہے اور پودوں کو حیوان کھاتے ہیں اور پھر حیوان کو حیوان کھاتے ہیں۔ اور انسان پودوں اور حیوانات دونوں کو کھاتا ہے (Chlorophyll) کے ذریعے خوراک تیار کرنے کے طریق کو (Photosynthesis) کہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے نظامِ ربوبیت کے چند اور کرشمے ملاحظہ فرمایئے۔ مچھلی اور مینڈک پانی میں انڈے دیتے ہیں۔ ان انڈوں کے اندر خوراک کا کوئی ذخیرہ نہیں ہوتا جس سے جنین کی نشوونما ہو سکے۔ ان کی خوراک پانی کے اندر موجود ہوتی ہے جہاں سے وہ اسے براہِ راست حاصل کرتے ہیں۔ اسی لئے ان انڈوں کے گرد خول نہیں ہوتا کیونکہ انڈے کے اندر کا پانی خشک ہونے

کا احتمال نہیں ہوتا۔ اس سے اوپر کی سطح کے جانور (Reptiles)۔ رینگنے والے جانور اور پرندے ہیں۔ ان کے انڈے چونکہ خشکی پر ہوتے ہیں اس لئے ان کے سوکھ جانے کا احتمال ہوتا ہے۔ بنابریں ان کے اوپر خول بن گیا۔ خول والے انڈے چونکہ اپنے ماحول سے براہِ راست خوراک حاصل نہیں کر سکتے اس لئے ان کے اندر جنین کی پرورش کے لئے غذا کا بڑا ذخیرہ موجود ہوتا ہے، جس طرح مرغی اور بطخ کے انڈے کی زردی اور سفیدی ہے۔ علاوہ ازیں خود انڈے کا خول بھی اللہ کے نظامِ ربوبیت کا عجیب کرشمہ ہے۔ خول کے اندر سے انڈے کا پانی بخارات بن کر باہر نہیں آ سکتا لیکن خول میں مسام ہوتے ہیں جن کے ذریعے باہر سے آکسیجن خون کے اندر داخل ہو سکتی ہے۔ اب اس سے اوپر کے درجہ کی طرف آیئے۔ دودھ دینے والے جانوروں کا انڈا چونکہ رحمِ مادر میں نشوونما پاتا ہے اس لئے اس کے گرد خول کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اور اس انڈے کے اندر جنین کی پرورش کے لئے خوراک بھی نہایت قلیل مقدار میں ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر انسان کے (OVUM) کو لیجئے۔ اس کی (FERTILISATION) یعنی مرد کے (Cell) سے اختلاط (Fallopian Tube) کے اندر ہوتی ہے۔ ٹیوب سے رحم تک پہنچنے کے لئے ایک ہفتہ درکار ہوتا ہے۔ جب یہ رحم مادر کے اندر اپنی جگہ پکڑ لیتا ہے تو جنین کی خوراک براہِ راست ماں کے خون سے ملنی شروع ہو جاتی ہے۔ چنانچہ انسانی (OVUM) کے اندر خوراک کی مقدار اتنی ہی ہوتی ہے، جو چند دنوں کے لئے کافی ہو۔ جب جنین رحم مادر کے اندر اپنے قیام کی مدت پوری کر لیتا ہے تو ماں کا دودھ تیار ملتا ہے۔

اسی طرح پانی کی طرف دیکھئے۔ سمندر کے پانی میں نمکیات اتنے زیادہ ہوتے ہیں۔ (ملحٌ اجاج) کہ اسے زبان پر رکھنا بھی محال ہوتا ہے۔ سورج کی گرمی سے یہ پانی بخارات بن کر ہوا میں اڑ جاتے ہیں۔ ہوا میں ٹھنڈے ہو کر بخارات جم جاتے ہیں۔ پھر بارش برستی ہے اور صاف ستھرا میٹھا پانی (عذبٌ فرات) جانداروں کو پینے کے لئے ملتا ہے۔ یہ پانی ندیوں اور دریاؤں میں زمین کے ساتھ رگڑ کھاتا ہوا نشیب کی طرف آتا ہے تو اس میں نمکیات پھر اکٹھے ہو جاتے ہیں اور یوں پانی ''عذب فرات'' سے پھر ''ملح اجاج'' بن جاتا ہے۔ اگر سورج کی حرارت سے پانی کے اوپر چڑھنے کا عمل اور Gravity کے ذریعے پانی کے نیچے اترنے کا عمل جاری نہ رہے تو زمین کا سارا پانی ''ملحٌ اجاج'' بن جائے اور زمین پر سے زندگی ناپید ہو جائے۔ اسی لئے رب العالمین نے فرمایا:

اَفَرَءَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِيْ تَشْرَبُوْنَ ﴿٦٨﴾ ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ ﴿٦٩﴾ لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ ﴿٧٠﴾ (56:68-70) ''پھر اس پر غور کرو کہ جس پانی کو تم پیتے ہو اس کو بادلوں سے تم برساتے ہو یا ہمارا قانونِ ربوبیت برساتا ہے۔ اگر ہم اسے کھاری بنا دیتے تو تم کیا کرتے! تو پھر تم شکر گزار کیوں نہیں ہوتے؟

وَقَدَّرَ فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا (41:10) کی داستان طویل ہے۔ میں نے صرف چند نمونے پیش کئے ہیں۔ وَبٰرَكَ فِيْهَا وَقَدَّرَ فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا (41:10) کے الفاظ کو سامنے رکھ کر غور کیجئے۔ انسان کے دل سے بیساختہ آواز اٹھتی ہے کہ: الحمدللہ رب العالمین۔

محمد علی صابر صدیقی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نشست نمبر 7

نوجوانوں کا صفحہ

نخلِ سینا

آج ویک اینڈ ہے اور سارا خاندان ڈرائنگ روم میں موجود ہے سوائے شکیل الزماں کے جو کرکٹ میچ کھیلنے کے لئے گئے ہوئے ہیں۔ کلیم الزماں بائی دی وے اپنے نسخے کی تعریف کر رہے ہیں کہ پروردگار نے انسان کو کتنی چھوٹ دے دی ہے کہ اگر برائی کر بیٹھو تو جلدی سے کوئی نیکی کر ڈالو۔ ان الحسنات یذہبن السیآت۔ کہ اتنے میں شکیل الزمان کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ ان کا اُترا ہوا چہرہ دیکھ کر کلیم الزماں کہتے ہیں۔

کلیم الزماں: کیوں بیٹا جی! میچ ہار آئے ہو۔ میں نہ کہتا تھا کہ کوئی بھی کام کرنے کے لئے مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر ٹیم روزانہ پریکٹس نہ کرے تو باجماعت نمازیں پڑھنے سے میچ جیتے نہیں جاسکتے۔

شکیل الزماں: ابو! آپ کو نماز پر کیوں اعتراض ہے؟

کلیم الزماں: بیٹا! میں نماز پر اعتراض نہیں کر رہا۔ میں اس تصور پر اعتراض کر رہا ہوں جو تمہاری ٹیم نے میچ کے ساتھ وابستہ کر رکھا ہے۔ میرے خیال میں نماز تو ایسی مفید چیز ہے جس کی افادیت سے مسلمان ایک ہزار سال سے بے خبر ہے۔ نماز تو مسلمانوں کے پاس ایسی پراپیگنڈا مشین ہے جو دنیا کی کسی قوم کے پاس نہیں ہے۔ بڑے دکھ کی بات ہے کہ پراپیگنڈا کے لفظ کو لوگ اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ یہ کسی تصور کو عام کرنے کا ذریعہ ہے اور جدید اسلامی تصورات کو اگر مقبول عام حاصل ہوا تو مساجد کے ذریعہ ہوگا جہاں مسلمان پانچ وقت نماز کے لئے اکھٹے ہوتے ہیں۔ مسجد کا ذکر جو آیا تو عالم آرا نے سوال کر دیا کہ آپ پچھلے جمعہ جو مسجد میں گئے تھے تو آپ کا جوتا محفوظ رہا یا بدل گیا۔ بیٹی خیریت ہی رہی کیا کیا جائے۔ قوم کا اخلاق اتنا بگڑ چکا ہے کہ لوگ مسجد میں بھی چوری کرنے سے باز نہیں رہتے۔ ہم نے ایک صاحب کے متعلق سنا ہے کہ وہ جب بھی صبح سویرے مسجد میں آتے تو ان کے ہاتھوں میں ایک پنجرہ ہوتا تھا۔ جس میں شاید ایک تیتر ہوتا تھا اور پنجرے پر کپڑے کا غلاف پڑا ہوتا تھا۔ نماز سے فارغ ہو کر وہ کبھی کبھار ایک جوتا بھی پنجرے میں رکھ لیتے تھے۔

عالم آرا: ابو! آپ کی مہم کیسی رہی؟

کلیم الزماں: بیٹی! نوجوان طبقہ ملائیت سے نالاں ہے۔ چند نوجوانوں نے علامہ پرویز سے ملنے کی خواہش کی تو میں نے انہیں بتایا کہ وہ تو وفات پا چکے ہیں لیکن الیکٹرانک ذرائع سے ان کے دروس محفوظ کر لئے گئے ہیں جو کسی بھی طلوع اسلام کی ویب سائٹ پر سنے اور دیکھے جا سکتے ہیں۔ میں نے انہیں یہ بھی بتایا کہ اگر انہوں نے علامہ اقبال کی شاعری یا علامہ پرویز کے دروس سے صرف ذہنی طور پر لطف اندوز ہونا ہے تو اس سے کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ وہ تو ایسے ہی ہے کہ دیوان غالب پڑھ کر حظ اٹھالیا، یا آل پاکستان مشاعرہ میں واہ واہ کر لی۔ جب تک دل پر چوٹ نہ لگے، جب تک اللہ تعالیٰ کے کلام کی عظمت اور جلال سارے جسم میں تھرتھراہٹ پیدا نہ کر دے، جب تک کلام الٰہی کو سمجھنے کے بعد رونگٹے کھڑے نہ ہو جائیں بات نہیں بنتی۔ میں ان سے گفتگو کر رہا تھا تو ایک نوجوان نے کہا، کہ ہم نے سنا ہے کہ پرویز صاحب پر کفر کا فتویٰ لگا تھا تو میں نے انہیں بتایا کہ کفر کا فتویٰ تو علامہ اقبال پر بھی لگا تھا اور سرسید احمد خان پر بھی لیکن تاریخ نے ثابت کر دیا کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں یہ کہنے کا حق ہے کہ

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

میں نے ان سے پوچھا کہ آپ لوگوں نے نماز جمعہ پڑھی ہے اس سے کیا حاصل ہوا ہے۔ ایک نوجوان نے کہا کہ دل کو تسلی ہوئی ہے کہ ایک فرض ادا ہو گیا۔ میں نے انہیں بتایا کہ نماز جمعہ کی اہمیت کے پیش نظر صرف مبہم سی تسلی کافی نہیں کچھ اور بھی ملنا چاہیے تھا۔ ایک نوجوان نے کہا کہ آپ بتائیں کہ کیا ہونا چاہیے اور کیا ملنا چاہیے؟

عالم آرا: ابو! آپ کی باتوں کا کسی نے برا تو نہیں منایا؟

کلیم الزماں: بیٹی! آج کا نوجوان ایک ایسی بھیڑ کی طرح ہے جو اپنے گلے سے بچھڑ گئی ہو اور اسے راستہ کی تلاش ہو۔ میں نے انہیں علامہ اقبال کا شعر سنایا۔

ہے وہی تیرے زمانے کا امام برحق جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے

ہمارے ہاں ایک ہزار سال بلکہ اس سے بھی پہلے سے روایت چلی آ رہی ہے کہ لوگ نہا دھو کر جامع مسجد کا رخ کرتے ہیں۔ جمعہ کی نماز کی دو رکعت ختم ہوتے ہی لوگ دروازے کی طرف بھاگتے ہیں۔ ان میں سے کچھ جمعہ کا خطبہ سننے کے لئے باادب مسجد میں قیام پذیر رہتے ہیں۔ امام جو خطبہ پڑھتا ہے نمازی خاک نہیں سمجھتے کہ وہ خطبہ میں کیا کہہ رہا ہے اور بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ مولوی صاحب کو خود بھی خطبہ کے معنی نہیں آتے۔ اگر اس روایت میں تھوڑی سی تبدیلی کر دی جائے تو کیا حرج ہے۔ لیکن ملا کا منجمد دماغ کسی بھی تبدیلی کو جائز نہیں سمجھتا اور اگر کوئی تبدیلی پر اصرار کرے تو کفر کا فتویٰ تو ہے ہی ملا کے پاس (ریڈی میڈ) امریکہ میں یورپ کے کئی ملکوں میں ماہرین مختلف موضوعات پر کمیونٹی سنٹروں میں تقاریر کرتے

ہیں اوران کا لیکچر سننے کے لئے ٹکٹ خریدنا پڑتا ہے۔ اگر ہمارے ہاں یہ روایت چل پڑے تو شہر کی ہر جامع مسجد میں کوئی استاد یا کوئی ماہر فن مفید معلومات پر گفتگو کرے تو کیا حرج ہے۔ موضوعات لاتعداد ہیں۔ حفظان صحت پر کینسر سے محفوظ رہنے کے لئے ہدایات پر، بچوں کی تعلیم پر لیکچر دیئے جا سکتے ہیں۔ اگر معاملہ خواتین کا ہو تو امور خانہ داری پر کوئی خاتون مفید معلومات فراہم کر سکتی ہے۔ خواتین کے موضوعات بھی باورچی خانے سے بیوٹی پارلر تک پھیلے ہوئے ہیں اور یہ سب مفت حاصل ہو رہا ہے۔ جو لوگ اسلام کو فلسفیانہ سطح پر سمجھنا چاہتے ہیں وہ اپنی سوسائٹی مسجد ہی میں قائم کر سکتے ہیں۔ علامہ پرویز کا کہنا ہے کہ قرآن مجید کو پڑھتے وقت اس کے ایک ایک لفظ پر غور کرنا چاہیے، مثلاً ہم اردو میں کہتے ہیں ہوا و ہوس الھوا کے عربی زبان میں استعمال کو اس پتھر سے تشبیہ دی جاتی ہے جو ڈھلان سے لڑھک رہا ہو۔ جوں جوں وہ آگے جاتا ہے اسکی رفتار بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اگر انسانی زندگی میں اس تصور کی مجسم تصویر دیکھنی ہو تو اسے انگریزی ناول " ڈاکر جیکل اینڈ مسٹر ہائیڈ " کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ بیٹی! ان نوجوانوں میں سے ایک نے وہ ناول پڑھا ہوا تھا۔ وہ پھڑک اٹھا۔ اسے دیکھ کر دوسرے نوجوانوں کی آنکھوں میں اشتیاق کی چمک پیدا ہوگئی۔ ہاں تو میں ان نوجوانوں سے یہ کہہ رہا تھا کہ اسی قسم کا متجسس رویہ عام نمازوں میں اگر جاری ہو جائے تو مسلمانوں کی زندگی میں بہت جلد انقلاب آجائیگا اور میرا پختہ ایمان ہے کہ انقلاب جب بھی اٹھے گا مساجد سے اٹھے گا۔ اسلئے ضروری ہے کہ امام مسجد نہایت تعلیم یافتہ ہو اور اسے حالات حاضرہ کے متعلق اچھی خاصی واقفیت ہو۔

عالم آرا: ابو! کیا مذہبی پیشوائیت آپ کو وہ انقلاب لانے دے گی جس کی تمنا آپ کر رہے ہیں؟

کلیم الزماں: بیٹی! یہاں میرا ذکر کوئی معنی نہیں رکھتا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ انقلاب جس کا میں ذکر کر رہا ہوں ایک صدی کے بعد آئے لیکن آئیگا ضرور اور وہ بھی پڑھی لکھی نسل کے ہاتھوں جو پیشہ ور ملا نہیں ہوں گے اور شاید وہ ظاہری شکل و شباہت کو بھی اہمیت نہیں دیں گے۔ داڑھی رکھنا ان کے لئے فرضیت میں شامل نہیں ہوگا۔

جہاں آرا: ابو جی! روزوں کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

کلیم الزماں: بیٹی! روزوں کے متعلق میرا خیال یقیناً اس خیال سے مختلف ہے جو تمہارے سسرال میں ہے۔ میں روزوں کے نفسیاتی یا روحانی اثرات کا منکر نہیں لیکن میرے نزدیک اس کے مادی اثرات کو میرا ذہن زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ زندگی میں کئی درشت مقام پیش آتے ہیں۔ کہیں بھوک اور پیاس ستاتی ہے لیکن غصہ اور انتقام کی آگ بھڑک اٹھتی ہے ان سب حادثات اور واقعات کیلئے اپنے آپ کو تیار رکھنا اور ان کے بداثرات سے محفوظ رہنے کے لئے روزے بہترین ٹریننگ پروگرام مہیا کرتے ہیں۔ باقی رہے عوام، ان کو تو دلاسہ دیا جاتا ہے کہ اس ماہ صیام میں شیطان کو قید کر دیا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسی مہینہ میں شیطان کھانے پینے کی اشیاء کی دکانوں میں پوری توانائی سے رقص کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اگرچہ روزوں کا مقصد یہ بھی ہے کہ انسان اپنے جذبات پر قابو پانا سیکھ لے لیکن ہوتا یہ ہے کہ اسی مہینہ میں مسلمان کو غصہ بہت آتا ہے۔

روزوں کے مہینہ میں مسلمانوں میں اعتکاف میں بیٹھنے کی روایت بھی موجود ہے۔ جس کا اصل مقصد تو یہ ہے کہ انسان مسجد میں بیٹھ کر یکسوئی سے اپنے حالات کے مطابق اپنے مسائل کو حل کرنے کا طریقہ قرآن مجید کی تعلیم کی روشنی میں سوچے لیکن ہوتا بالکل اس کے برعکس ہے، یعنی تراویح کے بعد مصلے پر بیٹھ گئے اور تسبیح ہاتھ میں لے کر اللہ اللہ کرنا شروع کر دیا یا کچھ دیر قرآن مجید کی ناظرہ تلاوت کر لی، اونگھ آ گئی تو سو گئے۔ بھوک لگی تو کچھ کھا لیا، نماز کے وقت نماز پڑھی اور پھر عبادت کے لئے مصلے پر بیٹھ گئے۔ یہ سارا عمل ایک گھگو کی طرح کرتے رہے اور جب اعتکاف سے اٹھے تو ایک مبہم سی تسلی کے سوا کچھ پلے نہ پڑا۔ اعتکاف کے لفظ کا سلسلہ نسب اس سہ حرفی روٹ سے جڑتا ہے جس کا مطلب اس حالت کو بیان کرنا ہے جب عورت اپنے الجھے ہوئے بالوں کو کنگھی سے سلجھاتی ہے۔ لہٰذا اعتکاف کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ انسان اپنی اپنی حالت میں اپنے معاملات کو سلجھانے کیلئے قرآن مجید کی تعلیم سے راہنمائی حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ سیاستدان اپنی سطح پر سوچے، دکاندار اپنے حالات کے مطابق اور دہقان اپنے حالات کے مطابق اور عام انسان کے لئے یہ ہے کہ محلہ میں ہمسایوں کی اصلی یا مبہم بدسلوکی کی جو ئیں اس کے دماغ کے بالوں میں پڑ گئی ہوں تو انہیں قرآن مجید کی کنگھی سے نکال باہر پھینکے تا کہ عید کی نماز کے بعد جب وہ اپنے ہمسایہ سے بغلگیر ہو تو یہ عمل ایک منافق کا عمل نہ ہو۔

عقیل الزماں: ابو! میں بہ صد احترام آپ سے ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔ میں وکلا کی سوسائٹی میں گھومتا پھرتا ہوں۔ عدالت ہی میں میرا سارا وقت انہیں سے باتیں کرتے ہی گزرتا ہے اور ہمارے اپنے گھر میں بھی وہی باتیں ہوا کرتی تھیں جو عوام میں ہوتی ہیں لیکن حج کرنے کے بعد آپکا نقطہ نظر تبدیل ہو گیا ہے۔

کلیم الزماں: بس چپ رہو۔ میں وہ سب کچھ سمجھ گیا ہوں جو تمہارے دل میں ہے۔ یہ بات حج کرنے کے بعد کی نہیں ہے۔ مجھ پر بڑی ہی ہلکی طاقت کی اس روشنی کی ایک لہر گری ہے جس نے نخل سینا کو بھسم کر دیا تھا اور یہ صدقہ ہے علامہ پرویز کی نگارشات کا اور علامہ اقبال کی شاعری کا جنہوں نے کہا تھا کہ

حقیقت را بہ رندے فاش کردند کہ ملا کم شناسد رمز دیں را

اب آخری بات رہ گئی قربانی اور حج کی۔ قربانی کی فرضیت تو پہلے ہی علما کے نزدیک زیر بحث ہے البتہ حج کو فرضیت کا درجہ حاصل ہے۔ یہ بڑا ہی نازک موضوع ہے۔ لوگوں کو اکثر یہ کہتے سنا ہے کہ حج کے بعد انسان کے سارے گناہ دھل جاتے ہیں اور وہ ایسا معصوم ہو جاتا ہے جیسا کہ وہ ماں کے پیٹ سے نکلا تھا۔ یعنی ملا نے یا کسی اور نے مسلمان کو یہ دستاویز لکھ دی ہے کہ ساری عمر حرام زدگیاں کرو اور جب اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا وقت آئے تو جھٹ سے حج کر ڈالو، میرے نزدیک حج کا جو مقصد ہے وہ عرب کی ملوکیت کو کبھی گوارا نہ ہو گا وہاں تو علامہ اقبال کے خیالات پر بھی قدغن ہے۔

عقیل الزماں: ابو! آپ اپنی سکیم بتائیں۔ حج کا مقصد کیا ہونا چاہیے۔

کلیم الزماں: بیٹا! یہ کوئی چیستان نہیں۔ آج کل کا تھوڑا بہت پڑھا لکھا انسان اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ انسانیت کی خیریت اسی میں ہے کہ قوموں کے درمیان پیار و محبت کا رشتہ قائم ہو اور اس پیار و محبت کے رشتے کی ابتداء دنیا میں پہلے ان اقوام میں شروع ہو جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے اور سمجھتے ہیں اور وہ اسی غرض سے سال میں ایک دفعہ طواف کعبہ کے لئے آتے ہیں، جسے حج کہا جاتا ہے۔ میرے خیال میں حج کا اجتماع مسلم اقوام کی یو این او (UNO) ہونی چاہیے جہاں تمام اقوام کے نمائندے مل بیٹھ کر اپنے پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کی کوششوں کے متعلق آپس میں مشورہ کریں، میں سمجھتا ہوں کہ اس سکیم کو مفید بنانے کے لئے مکہ یعنی بیت الحرم میں ایک حج ڈائریکٹریٹ قائم کی جائے اور چھوٹے پیمانے پر اسی قسم کی ڈائریکٹریٹ ہر اسلامی ملک میں وزارت خارجہ کا ایک حصہ ہو اور ان تمام ڈائریکٹریٹوں کا رابطہ مرکزی ڈائریکٹریٹ سے مسلسل قائم رہے اس رابطہ کے لئے آج دنیا میں انٹرنیٹ کا وسیلہ موجود ہے۔ جس کے ذریعہ مسلم ممالک ایک دوسرے کے معاشی، معاشرتی، سیاسی اور غیر سیاسی حالات سے ہر وقت آگاہ رہ سکتے ہیں۔ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہو سکتے ہیں اور ضرورت کے وقت ایک دوسرے کی مدد کر سکتے ہیں۔ ایک دوسرے ملک کی صنعت اور تجارت سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور انکے علمی کارناموں سے آگاہی ہو سکتی ہے اور مرکزی ڈائریکٹریٹ ہر قوم کی راہنمائی کر سکتی ہے۔ اس موضوع کی تفاصیل کے لئے تو دفتر کے دفتر درکار ہوں گے۔ مختصراً حج کے موقع پر ہر قوم اپنی کارکردگی پیش کرے جو مرکزی ڈائریکٹریٹ شائع کرے اور آئندہ کیلئے کوئی پروگرام وضع کر کے مسلم اقوام کو اس سے آگاہ کرے لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شد۔ ہماری اپنی زندگی میں تو ایسا ہوتا نظر نہیں آتا، مجھے یقین ہے کہ ایسا ہو کر رہے گا۔ آج نہیں تو کل ضرور ہوگا کیونکہ قرآن مجید کا اس طرف اشارہ ہے کہ جب سمندر معمور ہو جائیں گے اور صحیفے اور رسل و رسائل زیادہ ہو جائیں گے تو زمین اللہ تعالیٰ کے نور سے جگمگا اُٹھے گی۔ حالات تو پیدا ہو گئے ہیں لیکن یہ کب ہوگا اللہ ہی جانتا ہے۔ حج کا مقصد تو میں نے اپنی سمجھ کے مطابق بیان کر دیا ہے اور اس کی حقیقت کے مزید پہلو بھی ہو سکتے ہیں لیکن موجودہ زمانے میں مسلمانوں نے اس تقریب کا غلط فائدہ اٹھاتے ہوئے بڑے گھناؤنے برتاؤ کا ارتکاب کیا ہے۔ منشیات کی سمگلنگ کے علاوہ سونے کی سمگلنگ کے لئے نئے نئے طریقے ایجاد کئے ہیں۔ لطیفہ کے طور پر ایک حاجی کوفتہ کی کہانی بیان کی جاتی ہے کہ وہ جب حج کرنے کے بعد کراچی ایئر پورٹ پر آئے تو ان کے سامان میں ایک ہنڈیا بھی تھی جس میں نرگسی کوفتے تھے لیکن جب کسٹم والوں نے چیکنگ کے دوران ایک کوفتے کو توڑ کر دیکھا تو انڈے کی بجائے اس میں سے سونے کی ایک اینٹ نکلی۔ ہمیں یہ معلوم نہیں کہ اس کے بعد کیا ہوا لیکن حاجی کوفتہ کی کہانی ہماری تاریخ کا حصہ بن گئی۔ اس ساری بحث کے بعد زکوۃ کا مسئلہ رہ جاتا ہے جو سب سے زیادہ پیچیدہ ہے۔ اس پر آئندہ کسی وقت گفتگو کریں گے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بچوں کا صفحہ

دوسروں کے لئے جیو

آپ نے کبھی کتے کی حرکتیں دیکھی ہیں؟ ایک کتے کو دوسرا کتا اچھا نہیں لگتا۔ وہ اپنے جیسے کتوں کو دیکھ کر بھونکتا ہے۔ خود ہڈی پکڑ کر بیٹھا ہو تو گزرتے ہوئے ہر کتے کو غصے سے دیکھتا ہے۔ اسے اپنے جیسے کتوں کے ساتھ کوئی محبت نہیں ہوتی۔ مالک کا وفادار کتا دوسرے کتوں کی جان کا دشمن ہوتا ہے۔

کتے کے متعلق مشہور ہے کہ وہ اپنی گلی میں شیر ہوتا ہے۔ کوئی اجنبی کتا بھُولے بھٹکے اس کی گلی میں آجائے تو وہ اس کے پیچھے پڑ جاتا ہے۔ خود بھونکتا ہے۔ بھونک بھونک کر گلی کے تمام دوسرے کتوں کو بلاتا ہے اور سب کتے مل کر اس مسافر کتے کو دور بھگا کر چھوڑتے ہیں۔

اب تک بات کتے کی ہو رہی تھی۔ تم یقیناً سوچ رہے ہو گے کہ کتے کی یہ عادت بہت بُری ہے کہ وہ اپنے بھائی کو دیکھ کر نفرت اور غصے سے بھر جاتا ہے۔ دوسرے کتے کو تکلیف پہنچا کر اسے خوشی ہوتی ہے۔ وہ خود حرص اور لالچ سے کھا پی لیتا ہے مگر دوسرے بھوکے کتے کو حصہ نہیں دیتا۔ اپنوں کے ساتھ اُسے کوئی ہمدردی نہیں ہوتی۔

اب تم تھوڑی دیر کے لئے کتے کی بات بھول جاؤ اور یہ سوچو کہ تم سے کوئی یہ کہے کہ فلاں شخص اپنے بھائی کو دیکھ کر نفرت اور غصے سے بھر جاتا ہے۔ دوسرے آدمی کو تکلیف پہنچا کر اُسے خوشی ملتی ہے۔ وہ خود حرص اور لالچ سے کھا پی لیتا ہے مگر دوسرے بھوکے آدمی کو حصہ نہیں دیتا۔ اپنوں کے ساتھ اسے کوئی ہمدردی نہیں ہوتی۔۔۔ تو ایسے شخص کے متعلق تم کیا سوچو گے؟

تم یقیناً کہو گے کہ وہ اچھا آدمی نہیں ہے۔ وہ خود غرض آدمی ہے اور صرف اپنی ذات کا بھلا چاہتا ہے۔ حیوان اور انسان میں فرق یہی ہے کہ حیوان اپنی ذات کے لئے جیتا ہے۔ وہ اپنے فائدے کا خیال رکھتا ہے اور بس۔ دوسرے کے فائدے سے اسے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ انسان صرف اپنے لئے نہیں بلکہ دوسروں کے لئے بھی جیتا ہے۔

تم نے پڑھا ہو گا کہ ہندوستان کے ساتھ جنگ کے دوران ہمارے لوگوں نے ''قربانی'' دی تو اس کا مطلب یہی ہے کہ ان لوگوں نے اپنی ذات کے لئے نہیں بلکہ دوسروں کے لئے، ملک کے لئے اور قوم کے لئے اپنا آرام، اپنا مال بلکہ اپنی جانیں تک قربان کر دیں۔

دنیا میں لوگوں نے دولت کے ڈھیر اکٹھے کئے۔ حکومت حاصل کر کے بادشاہ بنے۔ مگر دنیا نے یاد ان کو رکھا جو دوسروں کی خاطر زندہ رہے اور دوسروں کی خاطر مرے۔ خالد بن ولیدؓ، محمد بن قاسمؒ، طارق بن زیادؒ اور موسیٰ بن نصیرؒ کے نام صدیوں سے عقیدت اور محبت سے لئے جاتے ہیں اور انہیں ہمیشہ اسی عزت اور پیار سے یاد کیا جائے گا۔

تم نے راشد منہاس اور عزیز بھٹی شہید کا نام تو سنا ہوگا۔ ان شہیدوں کا کمال کیا ہے؟ یہی نا کہ انہوں نے اپنے فائدے اور آرام کی پروانہ کی بلکہ تن، من اور دھن سب کچھ قربان کر دیا۔ محض اس خیال سے کہ قوم سربلند ہو اور وطن محفوظ رہے تاکہ اس میں اسلام کا بول بالا ہو سکے۔

دیکھنا یہ ہے کہ سکول میں اپنی جماعت کے کمرہ میں بنچ یا ڈیسک پر بیٹھتے ہوئے تم کسی ساتھی یا ہم جماعت کو دیکھ کر اور پھیل جاتے ہو کہ وہ تمہارے ساتھ نہ بیٹھ سکے یا تم سکڑ کر اُسے خود پاس بیٹھنے کا کہتے ہو؟

بس میں سوار ہوتے وقت، ہلڑ بازی کرتے ہوئے، قطار توڑتے ہوئے، اندر داخل ہوتے ہو یا شرافت سے ان لوگوں کو پہلے چڑھنے کا موقع دیتے ہو جو قطار میں تم سے آگے کھڑے ہوتے ہیں؟ اور پھر بس میں پہنچ کر تم جلدی جلدی سیٹ پر بیٹھ جانے کی کوشش کرتے ہو یا کسی بوڑھے، معذور یا اپنے سے کسی چھوٹے کو سیٹ پر بٹھا کر خود کھڑے رہتے ہو؟

دوستوں اور ہم جماعتوں میں تم اپنی ہی باتیں کہے چلے جاتے ہو یا اپنی کہہ کر دوسروں کو بھی کہنے کا موقع دیتے ہو؟ گھر میں کبھی کوئی مٹھائی وغیرہ آتی ہے تو تم ضد اور لالچ کر کے اپنے حصے سے زیادہ کھا لینے کی کوشش کرتے ہو یا اپنے بہن بھائیوں میں بیٹھ کر محض اپنے حصے کی چیز کھا کر مطمئن ہو جاتے ہو؟

ایسا تو نہیں کہ گھر میں جو کچھ پکتا ہے وہ عام طور پر تمہیں پسند نہیں ہوتا اور ہر روز تم نئی چیز کی فرمائش کر دیتے ہو؟

ابّا اور امی کو تم ضد اور شور و غوغا سے پریشان رکھتے ہو یا ان کے کام میں ہاتھ بٹا کر یا اچھی اچھی باتیں کر کے ہی ان کا دل خوش کرنے کی کوشش کرتے ہو؟

ایسا تو نہیں کرتے کہ جس امتحان میں فیل ہو جاتے ہو اس کی رپورٹ گھر لاتے ہی نہیں اور جھوٹ بول دیتے ہو کہ رپورٹ ملی ہی نہیں؟

چھوٹی بہن یا چھوٹے بھائی کو روتا دیکھ کر تم اس کا منہ چڑاتے ہو تا کہ وہ اور روئے یا اسے اٹھا کر اس کا جی بہلاتے ہو؟

اپنے کسی دوست، ہم جماعت یا ساتھی کو اداس دیکھ کر تم اس سے بچنے کی کوشش کرتے ہو یا اس سے اس کی اداسی کی وجہ پوچھتے ہو؟ اور اس کے ساتھ مذاق کرنے کی بجائے اس کی پریشانی دور کرنے کی کوشش کرتے ہو؟

تم کتنی بار ضرورت کے بغیر نئی کاپی، نیا قلم، نیا پنسل تراش یا نئی پنسل خرید لیتے ہو۔ آئندہ تم نے بلاضرورت پیسے خرچ کرنے سے بچنے کے لئے پکا ارادہ کر لیا ہے یا نہیں؟ پچھلی مرتبہ تمہیں جن باتوں کی پابندی کرنے کا جو طریقہ بتایا گیا تھا اس پر تم نے کس حد تک عمل کیا ہے؟

یہ اور اس طرح کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے تم اپنی جانچ پڑتال کر سکتے ہو۔ اس طرح کی جانچ پڑتال کر کے تم جہاں کہیں خرابی دیکھو، اُسے خود ہی ٹھیک کرنے کی کوشش کرو۔ کرو گے نا؟

Surah *Muhammad* (محمّد) – Durus-al-Qur'an: Chapter 7

By G. A. Parwez (Episode No.2)
(Translated by: Mansoor Alam)

To have the divine rule in real world, a government and its proper institutions are needed. Without capital resources this cannot be achieved. So, it requires sacrifice with open hearts on the parts of those who strongly support this mission. Because the divine system being established is for the benefit for all, those who show niggardliness (**بخل**) at this juncture are committing niggardliness (**بخل**) against their own "self": وَمَن يَبْخَلْ فَإِنَّمَا يَبْخَلُ عَن نَّفْسِهِ (47:38). Therefore, if this divine system fails to get established then, along with everyone else, the niggards will also perish. Giving preference to one's own self instead of the greater common good is inviting one's own self-destruction. One should never think that Allah is asking because He does not have the resources. This mindset is totally wrong: وَاللَّـهُ الْغَنِيُّ وَأَنتُمُ الْفُقَرَاءُ (47:38). He does not need anything from you. It is for your own benefit that He is asking you to contribute. If you don't, then Allah will raise another nation in your place which will not be like you: وَإِن تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُم (47:38).

In another place the Quran has mentioned this interchange of nations: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَا لَكُمْ إِذَا قِيلَ لَكُمُ انفِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّـهِ اثَّاقَلْتُمْ إِلَى الْأَرْضِ أَرَضِيتُم بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا مِنَ الْآخِرَةِ إِلَّا قَلِيلٌ إِلَّا تَنفِرُوا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا وَيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوهُ شَيْئًا وَاللَّـهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (9:38-39) – O مُؤْمِنِين (*Momineen*)! Sometimes it happens that when you are asked to march forth in the cause of Allah some weak-minded amongst you act as though they are rooted in the earth. They prefer worldly gains to the blessings of the life hereafter although the gains offered by the life of this world are insignificant in comparison to what the life of the hereafter offers. Remember, if you do not march forth Allah will certainly chastise you with a serious chastisement – and He will replace you by another nation. You can do no harm to Allah since He has control over everything.

And the Quran says that this other nation will NOT be like you (9:39). So, the question is: what kind of nation would that be? يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَن يَرْتَدَّ مِنكُمْ عَن دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّـهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ

يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّـهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ ۚ ذَٰلِكَ فَضْلُ اللَّـهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ ۚ وَاللَّـهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ (5:54) – O مُؤْمِنِين (*Momineen*)! Beware that if you turn away from Allah's دین (*Deen*) (you should not be under the impression that it will cause any harm to Allah, nay – you will in fact harm your own self, because) We will replace you by others who will obey His Laws in preference to everything else in the world; and the result of their obedience will be recompense from Allah. They will act with humility towards each other but will be firm towards their adversaries. They will strive hard in the cause of Allah and will not care about what others say. This is blessing from Allah which He bestows on those who wish to have it according to His Laws for Allah is infinite and All-Knowing.

In the above verse the words "يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ" have come. This is normally translated as "whom He loves and who love Him". The word "love" is an emotional and mental thing. This is not its root meaning in Arabic of the word حِبُّ (Hubbu). The Arabic word Al-'Hubbu (root 'h-b-b) has many meanings but these four are most important: 1) to hold onto something steadfastly; 2) to appear as the result of an action, like the appearance of grain budding within a well-tended plant; 3) to like and to love someone; and 4) to protect someone. In the light of the above, our love of God means to hold steadfastly onto His Book (Al-Qur'an), i.e., to follow and obey it. And His love to humans means He will protect us. And: أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ (5:54) – مُؤْمِنِين (*Momineen*) will act with humility towards each other but will be firm towards their adversaries. Allama Iqbal puts it in his own God-given beautiful style thus:

In the struggle of life be strong as steel
In the matter of love become soft as silk
Pass through hills and dales like fast moving seas
If floral gardens come by, be stirred with melodies

Iqbal has essentially explained above the following verse of the Quran: مُّحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّـهِ (48:29) ۚ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ – Muhammad, the Messenger of Allah and his companions are firm like hard rock in their resolve in dealing with the opponents of truth with, but are kind hearted and sympathetic amongst themselves. They strive hard in the cause of Allah and will not care about what others say: جَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّـهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ (5:54).

Striving hard in the struggle between THE TRUTH (*Al-Haq* - الحق) and FALSEHOOD (*Baatil* - باطل) for the cause of Allah and being firm in this conviction is a blessing from Allah which He bestows on those who wish to follow the goal set by Allah: ذَٰلِكَ فَضْلُ اللَّـهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ (5:54).

My dear friends, the guidance of the Quran is not limited to any particular nation. Allah is رَبِّ الْعَالَمِينَ (1:2); His Messenger is رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ (21:107); His Book is ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِينَ (12:104) – and it is for all humankind and for all time until eternity. There is no

question that if a nation leaves the Quran then the Quran will be defeated. If a traveler alights from the train of the Quran at a station then it does not mean that the Quranic train will not continue to move onward. The Quranic systems of humankind will continue to move ahead in the world. The Quranic train is not for any particular people; it is not for any particular nation; it is not for any particular time. This Quranic train will continue to move until eternity. Whichever nation decides to ride the Quranic systems train no matter what time – it will take that nation on its onward journey towards its destination.

My dear friends, I literally spent all my life in learning, teaching, and disseminating Quran's voice and its eternal message. I have struggle continuously in this mission for almost fifty years now. I also participated in Pakistan movement solely for the purpose of acquiring a piece of land so that the Quranic system could be established there; so that Allah will be the ruler of that nation through His Book as the sole constitution of that nation. These verses are before me. I have firm Iman on what Allah has said: that if you do not do what He says, then He will replace you with another nation; and that nation will not be like you. Allah's دین (*Deen*) will supersede all other systems of life: هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّـهِ شَهِيدًا (48:28) – This is because Allah has sent his Messenger with the Divine Code, which is a system based on absolute truth. It can thus overcome all other manmade systems. This can only happen if the party of مُؤْمِنِین (*Momineen*) becomes powerful and strong enough to wipe out the false systems based on injustice; and establishes the Divine Order instead. Allah watches over this process to ensure that it does come to fruition. So if this divine system does not get established here, then it will be established somewhere else. But, as I said before, my burning wish is that it gets established here because this land was acquired for this purpose. So, I continued to struggle after we got this piece of land. But if it does not get established here then it is not the defeat of the Quranic system. If after sunrise, if one closes one's eyes then the sunlight does not disappear. Actually, one deprives oneself of sunlight but the Sun keeps shining. Whichever nation will open its eye to sunlight of the Quran will benefit from it.

Another point to keep in mind: we hear that Islam is a spent force; that it may have once inspired people to the pinnacle of civilization but the world has changed; that it is no longer possible to unite all Muslims under one platform; that Muslim unity is a utopia. Leave aside non-Muslims, leave aside ordinary Muslims, even the so-called our great Islamic scholars say so. Why do they say that Islam is a spent force? Because they do not have the courage to say that we are Muslims since we were born in Muslim families and that we are NOT مُؤْمِنِین (*Momineen*). If we could gather courage and say that we are NOT مُؤْمِنِین (*Momineen*) then it will be a great service to Islam because then Islam will not be maligned in the world; and people will not judge Islam by looking at the condition of Muslims. But, here we are, that whatever we do

we call it Islamic and it fails to deliver the results. So, the world thinks that Islam is not practicable. So, we are in a way committing double crime: 1) we call "Islamic" whatever we do in the "name of Islam", and 2) since it fails, the world thinks that Islam has failed.

My dear friends, the Quran says that its system will prevail over all other systems. If it is not prevailing then it is clear that we are not implementing the Quranic system. If Quranic system was tried at one place and was not successful then it does not mean that it will not be successful in all places.

My dear friends, at the end this Surah I want to say something extremely personal. I think that the personal agony and pain that I have gone through – and I am still going through – in promoting the case for the establishment of Allah's دین (*Deen*) in this piece of land (Pakistan) is better summed up in Iqbal's words because he also went through similar agony and heart-wrenching pain. He wrote a complete chapter about it in his book "Javed Nameh" when describing the eternal divine message of the Quran. I am just presenting few verses here from this chapter.

Our assembly is deprived of Tauheed, our charge without leader
But the Quran is still there, its message is still there in its pages

It just needs its true message to be brought out loud and clear
Sky has many devotees to get its message out loud and clear

The Quran's message is eternal and not dependent on nations
Its message is not dependent on any particular place or time

Whether one cares or not, the Quran is eternally protected by Allah
It is not dependent on any country whether it be Rome or Shaam

If Allah has taken away the Quran from us since we abandoned it
Then He will give it to some other nation who will not be like us

Muslims are engaged in only blind following or mere speculation
When I see them doing this, then my soul and body start trembling

I am afraid of the day when the Quran will be taken away from us
And another nation will benefit from its light leaving us in darkness

My dear friends, we completed Surah Muhammad (محمّد) today. Next we will take up Surah **فتح** (*Fath*).

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ

O our Sustainer! Accept our humble efforts because you are fully aware of what we speak and what is hidden in our hearts. (2:127)

Surah Al-Najm (النجم) – Durus-al-Qur'an: Chapter 2

By G. A. Parwez (Episode No.1)

(Translated by: Mansoor Alam)

My dear friends, today is October 8, 1982 and our lecture starts with Surah Al-Najm (النجم) verse (53:1).

The second part of Mi'raj

As I mentioned in the last lecture, our scholars bring the proof of Mi'raj from this Surah and the first verse of Surah Bani Israel. I thought it proper to provide an introduction to the event of Mi'raj that continues as a tradition. This event is divided into two phases. In the last lecture, we discussed the first phase of the Prophet's (PBUH) stated journey on Buraq from Makkah to Jerusalem in the words of Maulana Maududi, considered to be a great scholar of the twentieth century.

Now we come to the second phase of the journey from Jerusalem to the heavens: after the Prophet (PBUH) led all the previous Prophets into prayer, a ladder was presented to him through which angel Gabriel took the Prophet (PBUH) to the heavens. In Arabic language Mi'raj means ladder and hence the name of this event. I thought it appropriate that I should present to you the details of this second part of the journey as well – again in the words of Maulana Maududi.

Here it is: "When the Prophet (PBUH) reached the first heaven then the angel guarding the door of the first heaven asked: Who is there? Gabriel replied, it is me. Then he asked: Who is with you? Gabriel replied: He is Muhammad. Then he asked: has been invited? Gabriel replied, yes. Then the door opened and the Prophet (PBUH) was greeted profusely and he was introduced to angels and some great souls who were the resident of the first heaven. Among them, there was one elder personality who was a perfect model of human being with total facial and body symmetry, and without any trace of flaw anywhere. Gabriel told the Prophet (PBUH) that he is the very first person Adam created by the Almighty. There were many persons on his right and left sides. When he saw those on the right he felt very happy. But when he saw those on the left then he felt very sad and he cried. The Prophet (PBUH) asked Gabriel, what is going on with him? Gabriel told that they are his progeny. When sees the good and pious ones on his right side he feels very happy. But when he sees his bad progeny on his left he feels sad and he cries.

"The Prophet (PBUH) then saw a group of people harvesting a crop. The more they were cutting the crop the more it was growing. Then he asked Gabriel, what is going

on here? Gabriel told that they are the Mujahedin who did Jihad in the way of Allah. Then the Prophet (PBUH) saw that there were people whose head was being crushed with stones. When the Prophet (PBUH) enquired about them then he was told that these are the people whose mental burden stopped them from praying. Then he saw people wearing patched clothes and were grazing grass like animals. He was told that they are those who did not pay Zakat from their wealth. Then the Prophet (PBUH) saw a person trying to lift a bundle of woods but could not lift it. Instead of remove some of the woods so that he could lift the bundle, he was putting more and more woods into the bundle and was trying to lift it and failing repeatedly. After seeing this the Prophet (PBUH) asked who is this idiot? He was told that this was the person who could not bear his responsibilities and trusts, but then instead of reducing them he kept on increasing them. Then the Prophet (PBUH) saw that there are some whose lips and tongues were being chopped off with scissors. Why was this being done to them? Because they used to gossip and spread rumors. At one place a bull came out from inside the crack of a stone and then tried to go back in through the crack but could not. The Prophet (PBUH) asked what is going on here? The reply came that this is an example of a person who was reckless and said insidious things and then felt sorry and wanted to retract but could not. At another place there were people who were cutting their own flesh and eating it. What is going on here? He was told these are the people who used to malign others....

"This continued until the Prophet (PBUH) and Gabriel reached the second heaven. The Prophet (PBUH) met Yahiya (PBUH) and Jesus (PBUH) there. On the third heaven there was a gentleman who was so handsome compared to common man as if he was full moon compared to stars. He was Yusuf (PBUH). On the fourth heaven the Prophet (PBUH) met Idris (PBUH), on the fifth heaven he met Harun (PBUH), on the sixth heaven he met Musa (PBUH). On the seventh heaven he saw a huge beautiful palace where there was heavy traffic of angels going in and out of the palace. The Prophet (PBUH) met there an elderly gentleman who looked like him. He was told that he is Prophet Ibrahim (PBUH). After further travel the Prophet (PBUH) reached Sidrat-ul-Muntaha. Everyone stops here. No further entry is allowed after this except direct divine invitation. The Prophet (PBUH) was then shown the Jannah where such things were available which no one had seen nor heard nor even imagined before. At this place Gabriel stopped. The Prophet (PBUH) then went ahead alone and saw a grand lofty throne where Allah was sitting there. Allah and the Prophet (PBUH) conversed and Allah offered the following gifts to him: 50 obligatory prayers each day; the last two verses of Surah Al-Baqarah; everything will be forgiven except Shirk. He was told that if anyone intends to do good then he will get one reward for the intention and when he does it then he will get ten further rewards. However, if anyone intends to do bad and then does the bad thing then he will be charge with only one sin. After meeting Allah, the Prophet (PBUH) on his return journey met Musa

(PBUH) and mentioned what Allah had offered him. At this Musa (PBUH) said: I have bitter experience with Israelites and your Ummah would not be able to fulfil 50 prayers each day. Please go and get it reduced. So the Prophet (PBUH) went and pleaded with Allah to reduce it. Allah then reduced it by ten. At this Musa (PBUH) again said that your Ummah would not be able to fulfil even this many. So, the Prophet (PBUH) went back and forth at the insistence of Musa (PBUH) until Allah reduced it to five daily prayers, which will count as equal to fifty.

"On the return journey the Prophet (PBUH) came down on the ladder to Bait-al Muqaddas (بیت المقدس) in Jerusalem. Again, all the previous messengers were present there. The Prophet (PBUH) led all of them in Fajr prayer and returned to Makkah on Buraq. When Prophet (PBUH) told about his journey then the Kuffar made fun of him, and this news quickly spread to all of Makkah. Many who had accepted Islam left it. Then the Prophet (PBUH) mentioned signs he encountered in this journey. He told Meccans: I passed through so and so caravans that were carrying such and such things; that the camels in one caravan were disturbed by the flight of Buraq and one camel ran away to such and such valley; and he told about it to the caravan leaders so that they could find it. He further told them: that on my return journey I found everyone sleeping in a caravan; so I went there and drank water from a bowl and left a sign there; and that caravan later found a proof of this. After these proofs provided by the Prophet (PBUH) everyone was convinced and became quiet…."

There is one problem with traditional description of Mi'raj

This event of Mi'raj is considered as a great honor and respect for our Prophet (PBUH). But there is one issue here. The Prophet (PBUH) was born in Makkah in the most respected family of Bani Hashem of the tribe of Quraysh from the branch of Ibrahim (PBUH), who, along with his son Ismail (PBUH), built the Kaaba, the very first house of God. But, according to hadith, the Prophet (PBUH) for thirteen years were praying towards Bait-al Muqaddas (بیت المقدس) in Jerusalem, instead of Kaaba. However, in Makkah this conflict was resolved by praying in such a way that both Kaaba and Bait-al Muqaddas could be lined up in the same direction. But this was not possible in Medina. So, the Prophet felt tension in his heart praying towards Jerusalem, and not towards Makkah. Finally, as reported in hadith that after two or three years, the order came from Allah to switch the direction towards Makkah.

The traditional concept of change in Qiblah

My dear friends, as reported in hadith, the Prophet (PBUH) was praying Zuhr or Asr in a mosque (not the Prophet's Masjid) facing towards Jerusalem that suddenly the order came from Allah to change the Qiblah towards Makkah in the middle of the prayer. This new direction was in the opposite direction. Now the followers could move to the new direction simply by turning hundred eighty degrees at their own place. However, the Imam had to walk all the way (around the rows) and then stand in front of the rows – where the front row, now became the back row; and the back row

became the front row. That is how the Prophet (PBUH) completed the prayer. Because of this change in Qiblah this Majid is known as Masjid Qiblatain (Masjid with two Qiblahs). This Masjid then had two arches for the Imam – one towards Jerusalem and one towards Makkah. But now, when I visited, I found that only a sign of arch has been created on the wall to signify the original Qiblah towards Jerusalem.

As I mentioned before, please note that Prophet (PBUH) is not only a descendent from the family of Ibrahim (PBUH) but also he was from the Millah of Ibrahim (PBUH). He was from a prominent family of Hashim of the tribe of Quraysh. Kaaba was the center of all Arabs. Being custodians of Kaaba, Quraysh were highly respected in the entire Arabia. The entire operation of Kaaba was in their hands. Everyone's caravans were looted but not of Quraysh. Their caravans were busy all year round and no one could dare to glance at them with a bad eye, let alone loot them.

A great conspiracy to downgrade the respect of Kaaba

My dear friends, please note that the Prophet (PBUH) was born and raised in Makkah where Kaaba, the first how house God was the prominent center of religious and cultural life of all Arabs. But according to hadith he prayed towards Bait-al Muqaddas (بیت المقدس) in Jerusalem for thirteen years in Makkah and for another 2-3 years in Medina after migration. And according to research by Mr. Maududi, Jerusalem was nothing but rubbles; that Solomon temple had been demolished by the Byzantines and they were throwing garbage there, which Khalifa Umar (R) cleared himself to pray when Jerusalem was conquered during his reign. But the narrations (that were compiled two hundred years after the Prophet (PBUH) by Iranian Imams) say that the Prophet (PBUH) prayed towards it for thirteen years while in Makkah and two-three years in Medina! Do you notice my friends, how the status of Jerusalem has been raised compared to Kaaba by these fake narrations? And further, couldn't our Prophet (PBUH) go directly to the heavens from Makkah? Why did he have to go to Jerusalem first, and then to the heavens? Therefore, the narrations – described in different hadiths have many differences in their details regarding the same event – must have been concocted to raise the status of Jerusalem compared to Makkah.

Moses' (PBUH) role in reducing the number of prayers

My dear friends, don't ask how much differences the different narrations have about when this event occurred, and where was the Prophet (PBUH) sleeping when woken up by Gabriel. Different dates are found about this event in different narrations. Leave aside these differences, let us take the role of Moses (PBUH) played when he suggested to get the number of prayers reduced that Allah had offered the Prophet (PBUH). Just think about it my friends! Allah didn't know that Prophet's Ummah would not be able to fulfil this obligation but Moses (PBUH) knew that. And how the Prophet (PBUH) kept shuttling back and forth between Allah and Moses (PBUH) to get the number of prayers reduced at his suggestion, so much so that some narrations

mention that Moses (PBUH) suggested to the Prophet (PBUH) that his Ummah would not be able to fulfil even the five daily prayers; and at this the Prophet (PBUH) said that I feel ashamed to go to Allah now! Do you see how the narrators have raised the status of not only Jerusalem but also Moses (PBUH) compared to our Prophet (PBUH); and Allah, the all-knowledgeable, kept reducing the number at the suggestion of Moses (PBUH)? Israelites tell that if your Prophet (PBUH) had gone to God once more as suggested by our Prophet Moses (PBIH) then your five daily prayers would have been even reduced further!

According to the Quran we are required to believe in all the Prophets (Peace Be on All of Them). The most important command of Allah – the number of obligatory prayers – is finally being decided by Moses (PBUH), the messenger to Israelites who don't even believe in our Prophet (PBUH); whereas Muslims have to believe in all of the messengers although the Quran has said some were granted higher status that others depending upon the sphere of their influence. For example, our Prophet (PBUH) who is the last one and whose sphere of influence is the entire world and all human beings. So, it is obvious that this is a conspiracy must have been hatched to reduce the importance of our Prophet (PBUH).

The Quran's call to Jews and the status of the Prophet (PBUH)

The Prophet's majesty according to the Quran is that the revelation ended on him and the Quran is the final Book of Allah. Islam is the last *Deen* until eternity. It is complete and unchangeable forever. It abrogated all the previous *Deens*. The Quran has repeatedly instructed the Jews to believe in its message and its messenger, the Prophet Muhammad (PBUH). Moses (PBUH) has prayed to God that Thou has bestowed Thy Blessings on me and my people. I pray that please continue these blessings in future. The Quran says that Allah told Moses that a time will come when the final messenger will be sent and he will bring the final message to humanity; that if your people will accept his messenger-hood and follow his message, then these blessings will continue. Otherwise, not.

This is the position of Islam: as Deen and Prophet Muhammad (PBUH) as its Messenger. Israelites kept telling the Prophet (PBUH) that their Deen is superior. At this the Quran asks them to provide proof: قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ (2:111) – Provide the proof if you are truthful. No other Deen could claim superiority over Islam on the basis of proof. My dear friends, the Quran clearly told: لَا بُرْهَانَ لَهُ (23:117) – Our claim is based on much knowledge and reason. Whosoever says anything against it and invokes another authority, will find no evidence to substantiate his claim. So, all these narrations that make Jerusalem as the first Qiblah; that make Jerusalem as the place from which the Prophet (PBUH) went to heaven; that say that Moses (PBUH) was advising Prophet (PBUH) to get the prayers reduced – raise the status of Jerusalem over Kaaba and raise the status of Moses (PBUH) over our Prophet (PBUH). From only this point of view I am saying their Prophet and our

Prophet. Otherwise, to me all the Prophets (PBUH) all equally respectable. Anyway, it is clear that all these narrations are against the Quran and therefore fake; and have been the result of conspiracy by Jews. These narrations cannot be from the Prophet (PBUH). Christians did similar things: that Jesus (PBUH) was born without father; that he is alive in the heavens – so he is superior to Muslims' Prophet (PBUH) who was born like a common man and died like a common man. And here we are who accept all these fake narrations because these have been narrated in our hadith books. These things about Moses (PBUH) and Jesus (PBUH) are not only there in our narrations but have become our ideology and faith, which if and anyone rejects, is given fatwa that he has gone outside the fold of Islam. What deep conspiracies have been hatched with us my friends? May Allah protect us!

Hadith taught in our Islamic schools

My dear friends, not a single word of the Quran can be changed. Allah, the Almighty, Himself has taken the responsibility of protecting it. All the books of hadith were compiled more than two hundred years after the Prophet (PBUH) based on oral narrations from chain of narrators. There was no master copy and no printing machines those days. No one knows how these narrations came in these books. Anyway, for more than thousand years, these books which have all these narrations, are taught in Islamic schools. The ideology about these hadith books is that these books coexist with the Quran and are like the Quran; that anyone who rejects even a single hadith of Bukhari or Muslim exits from the fold of Islam. The belief is that just like the Quran these hadith books are based on revelation from Allah; that there are two kinds of revelations – one that is recited which is in the Quran and the other that is not recited and is in the hadith books; that if there is a contradiction between hadith and the Quran about a certain verse then the interpretation should be stretched somehow to fit the hadith with the Quran; and if that is not possible then that Quranic verse is considered abrogated. According to this traditional creed we can see what position the Kaaba and Prophet (PBUH) have compared with Bani-Israel's center of Bait-al Muqaddas (بیت المقدس) in Jerusalem and Moses (PBUH).

Our fabricated hadith has complicated the legal status of Bait-al Muqaddas

The issue regarding Bait-al Muqaddas that who should be its custodian; or who should control it; or even who should own it – is a current political issue. If Jerusalem issue remained as it was during the Prophet's time when there was nothing there except rubbles because the Byzantines had demolished Solomon temple and destroyed the city – and if a mosque was built there, it was built on empty place – then Jewish claim is without any proof. If we accept the Jewish claim that there was Solomon temple and Muslims demolished to build their mosque in its place, then a court will decide in Jewish favor. Our hadith books say that there was Solomon temple where Prophet (PBUH) led prayer and now if a mosque is there in its place then Solomon temple must have been demolished to build the mosque, no matter it

may have been built in 72 Hijrah by Abdul Malik during Umayyad rule. Thus these narrations provided the proof for the Jewish claim that there was Solomon temple and Muslims built their Mosque there.

Mr. Maududi's contradictory remarks in September 1969

My dear friends, let me repeat what I presented in the last lecture about contradicting statements of Mr. Maududi. He wrote in September 1969 that there was no Solomon temple in Jerusalem at the advent of Islam. This was correct. Therefore, Israeli claim does not stand any ground that Muslims demolished our temple and built their mosque there. But after some days in the same month and year he wrote that Bait-al Muqaddas in Jerusalem is the first Qiblah because the Prophet (PBUH) and his companions used to pray towards it; that being the first Qiblah this place of worship is always sacred to Muslims; that as long as our Prophet (PBUH) was in Makkah he prayed in such a way that Masjid al-Haram and Masjid Al-Aqsa were line up in the same direction. But this was not possible in Medina because both this Masjids were in opposite direction. So, he acknowledges that Masjid Aqsa was there at the time of the Prophet (PBUH) and this is reported in all the hadith books; and if you do not believe it then you are purged from Islam. So, we are providing proof for Israel's claim because it is all there in our hadith books. Now, it is worth pondering how these narrations got into our hadith books. There is nothing in the Quran about making Bait-al Muqaddas as first Qiblah. So, the question of changing Qiblah does not arise. Therefore, Kaaba was the Qiblah from the beginning. The Quran told the Prophet (PBUH): إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَ هُدًى لِّلْعَالَمِينَ (3:96) – The first House ever built for the entire humankind was Makkah. It was from this place that humanity was destined to get the guidance and the Divine Laws which would ensure stability and nourishment for all.

So, my dear friends, in light of the above, you can very well imagine what the true facts are, of what the narrations in different hadith books say about the first part of Mi'raj!

In the above verse the words "يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ" have come. This is normally translated as "whom He loves and who love Him". The word "love" is an emotional and mental thing. This is not its root meaning in Arabic of the word حِبُّ (Hubbu). The Arabic word Al-'Hubbu (root 'h-b-b) has many meanings but these four are most important: 1) to hold onto something steadfastly; 2) to appear as the result of an action, like the appearance of grain budding within a well-tended plant; 3) to like and to love someone; and 4) to protect someone. In the light of the above, our love of God means to hold steadfastly onto His Book (Al-Qur'an), i.e., to follow and obey it. And His love to humans means He will protect us. And: أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ (5:54) – مُؤْمِنِين (*Momineen*) will act with humility towards each other but will be firm towards their adversaries. Allama Iqbal puts it in his own God-given beautiful style thus:

To be continued

4- وہ دائرہ اسلام سے باہر چوٹی کے حکماء اور فُضلاء کو ذہن میں رکھیں کیونکہ یہی لوگ ہیں جن کے قائل ہونے سے دنیا کی ذہنی فضا سے باطل تصورات کا اثر زائل کیا جا سکتا ہے۔

5- وہ علمی دنیا کے مسلمہ حقائق سے آغاز کر کے ان قرآنی حقائق کی طرف آئیں جن کی صحت لوگوں کے نزدیک مسلم نہیں۔

6- کسی غلط عقیدہ کی محض نفی مخالفین کو قائل نہیں کر سکتی جب تک اس کے مقابل کے صحیح تصور کا اثبات نہ کیا جائے۔

7- وہ ایک فلسفہ یا ایک فلسفیانہ خیال کی تردید کے لئے جن تصورات کو صحیح سمجھ کر کام میں لائیں تو کسی دوسرے فلسفہ یا فلسفیانہ خیال کی تردید کرتے ہوئے اسے غلط قرار نہ دیں۔ بلکہ اپنے موقف پر قائم رہیں۔

8- مغرب کے صحیح تصورات کو نہ تو رد کریں اور نہ ہی ان کے غلط تصورات کو قبول کریں۔

9- ہر غلط فلسفہ کے اندر وہ جن تصورات کو صحیح سمجھیں انہیں دوسرے فلسفوں کی تردید کرتے ہوئے غلط قرار نہ دیں اور جن تصورات کو غلط سمجھیں، انہیں دوسرے فلسفوں کی تردید کرتے ہوئے صحیح قرار نہ دیں ورنہ وہ اپنی تردید خود کریں گے۔

(3) ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کا موقف:

1- کسی علمی صداقت کے ساتھ متصادم نہ ہو بلکہ ہر زمانہ میں تمام علمی صداقتوں کے ساتھ پوری طرح سے ہم نوا اور ہم آہنگ رہے اور جوں جوں علمی صداقتیں منکشف ہوں وہ اس کے اندر سماتی چلی جائیں۔

2- جس کے تمام تصورات ایک دوسرے کے ساتھ عقلی ربط وضبط رکھتے ہوں اور ایک دوسرے کی عقلی تائید اور توثیق کرتے ہوں۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے جب اس کے تمام تصورات قرآن کے بنیادی تصور کے ساتھ عقلی طور پر متعلق ہوں۔

3- جو تمام باطل فلسفوں کی موثر تردید کرتی ہو۔

4- جو کائنات کا ایک مکمل فلسفہ ہو اور حقیقتِ انسان و کائنات کے اہم مسائل کے بارے میں عملی راہ نمائی کرتی اور صداقت اور سچائی کا راستہ بتاتی ہو۔

5- جو علمی تصورات کی خامیوں کو آشکار کر کے انہیں پاکیزہ اور شُستہ بناتی ہو۔

6- جو ہمیں احکامِ دین کی حکمتوں اور علتوں کے پورے سلسلہ سے آگاہ کرتی ہو اور ان حکمتوں اور علتوں کا ایک ایسا تصور دیتی ہو، جس میں اندرونی طور پر کوئی تضاد نہ ہو۔

(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)

PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL.73
ISSUE
06

Monthly

TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546, 042-35753666
E-mail:idarati@gmail.com
Web:www.toluislam.com www.facebook.com/talueislam/



وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ (16:112)

قوموں پر اس قسم کی تباہیاں کیوں اور کب آتی ہیں اسے ایک مثال سے سمجھو۔ ایک بستی تھی جسے خارجی خطرات سے امن اور داخلی کشمکش سے اطمینان حاصل تھا۔ اس کی طرف ہر سمت سے سامانِ رزق کھنچا چلا آتا تھا۔ اس کے رہنے والے خوش حال اور فارغ البال تھے لیکن انہوں نے خدا کی بخشائشوں کی ناقدر شناسی کی (بڑے بڑے لوگوں نے انہیں اپنے لئے سمیٹنا اور چھپانا شروع کر دیا)۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان پر بھوک اور خوف کا عذاب طاری ہوگیا۔ فارغ البالی کی جگہ انہیں فاقے آنے لگے اور ان کا امن خطرات سے بدل گیا۔ یہ سب کچھ ان کے اپنے ہاتھوں کا لایا ہوا تھا۔ خدا نے اپنی بخشائشیں نہیں روک لی تھیں انہوں نے اپنے لئے جو غلط نظام قائم کیا یہ اس کا نتیجہ تھا (21:11-15؛20:124؛6:44)

(مفہوم القرآن از پرویزؒ)